PRINTED BOOK



سہ ماہی ممبئی

افکار رضا

پیام امام اہل سنت مجدد ملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ العزیز

اپریل تا جون ۲۰۰۷ء / ربیع الاوّل تا جمادی الاوّل ۱۴۲۸ھ

"اس دَور کے مشہور عالمِ دین جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب واقعی ایک عظیم مسلمان راہ نما ہیں، ہم بعض باتوں پر اختلاف کے باوجود، اُن کی عظیم شخصیت اور دینی راہ نما ہونے کا اعتراف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اس دَور کے سب سے بڑے محقق، مصنف، ادیب، شاعر، مدقّق اور مردِ حق ہیں۔ بلاشبہ ایسی ہستیوں کا وجودِ مسعود ہمارے لیے مرہونِ منّت ہے۔"

(مولانا محمد علی جوہر، روزنامہ "خلافت" بمبئی، ص ۴)

تحریک فکر رضا

۱۶۷، ڈم ٹمکر روڈ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۸ (انڈیا)

R.N.I. Registration No.: 71248/99

امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی ترویج کا علمی علم بردار

سہ ماہی افکارِ رضا ممبئی

اپریل تا جون ۲۰۰۷ء جلد ۱۳ شمارہ ۲ (۴۸) ربیع الاوّل تا جمادی الاوّل ۱۴۲۸ھ

مدیر : محمد زبیر قادری (موبائل: 98679 34085)

منیجر : محمد اسحٰق برکاتی (موبائل: 93239 54522)

Distributed in Pakistan By :

Markazi Majlis-e-Reza

P.O.Box: 2206, Lahore, Pakistan

Distributed in England By :

THE ISLAMIC TIMES

C/o. 138, Northgate Road,
Edgeley, Stockport, SK3 9NL ENGLAND

Distributed in Australia By :

SHEHZAD ALI

P.O. Box: 51, Lurnea 2170,
NSW, AUSTRALIA

Correspondence Address: رابطہ کا پتہ:

Tehreek-e-Fikr-e-Reza

167, Dimtimkar Road, Nagpada, Mumbai - 400 008.

Office Address: آفس کا پتہ:

95, Undria Street (Chowki Mohalla), Mumbai - 400 008 India

Website: www.fikreraza.net Email: editor@fikreraza.net

پرنٹر پبلشر محمد اسحٰق محمد عمر نے پرنٹ ٹاپ پرنٹنگ پریس 18، شنکر بلڈنگ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 400008 سے چھپوا کر دفتر 167، ڈم ٹمکر روڈ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 008 400 سے شائع کیا۔

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

متوسلینِ رضا

سب کا خالق مالک و مولا ہے یا اللہ تو — لاشریک و لم یزل یکتا ہے یا اللہ تو

ہر بشر کے ہر عمل کا ہے تیرے آگے حساب — خیر کی بہتر جزا دیتا ہے یا اللہ تو

تنکا تنکا بوٹا بوٹا کرتا ہے تیری ثنا — حمد بے آواز کو سُنتا ہے یا اللہ تو

علامہ بدر القادری

حمد باری تعالیٰ   نعت رسول

م۔ لئیق انصاری
محلہ اتر دروازہ رائے بریلی (یوپی)

حمد باری تعالیٰ

قدم چومے فتح و ظفر میرے مولیٰ
دعاؤں میں دے وہ اثر میرے مولیٰ

پہنچ جاؤں تیرے نگر میرے مولیٰ
ہوں نکلا یہی سوچ کر میرے مولیٰ

غنی ہوگیا ہوں مَیں دنیا میں پاکر
تری عبدیت کا گہر میرے مولیٰ

جمالِ حرم سے مَیں دل جگمگاؤں
دے مجھ کو بھی اذنِ سفر میرے مولیٰ

رواں ہیں جہاں قافلے روشنی کے
وہی ہے تری رہگذر میرے مولیٰ

ہلائے سے ہلتا نہیں ایک ذرہ
ہے مجبور کتنا بشر میرے مولیٰ

لبوں پر دعاؤں کے نغمات تیرے
مچلتے ہیں شام و سحر میرے مولیٰ

رہوں باخبر مَیں معائب سے اپنے
عطا کر مجھے وہ نظر میرے مولیٰ

لئیق سخن ور کی تجھ سے دعا ہے
ہو لہجہ عطا معتبر میرے مولیٰ

نعت رسول

ستم پر دے دعا کوئی نہیں ہے
مثالِ مصطفیٰ کوئی نہیں ہے

ہزاروں انبیائے سابقیں میں
حبیبِ کبریا کوئی نہیں ہے

ازل کا آئینہ تھا دل نبی کا
اب ایسا آئینہ کوئی نہیں ہے

سوائے آپ کے بزمِ جہاں میں
طلب گارِ خدا کوئی نہیں ہے

مثال اس کی کہاں سے لائے دنیا
کہ مطلوبِ خدا کوئی نہیں ہے

کرم کا آئینہ بزمِ جہاں میں
سوائے مصطفیٰ کوئی نہیں ہے

وہی تو ہیں بنائے بزمِ عالم
نہیں ہے دوسرا کوئی نہیں ہے

درِ اقدس کے روحانی سفر میں
سمجھ لو فاصلہ کوئی نہیں ہے

لئیق افکار پر در پردہ ان کے
کرم کی انتہا کوئی نہیں ہے

نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا

از: ڈاکٹر الطاف حسین سعیدی (ایم بی بی ایس)، پاکستان

اللہ کی شان ہے کہ دوسروں سے بات بات پر بخاری و مسلم یا صحاح ستہ سے صحیح حدیث کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے آج نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی صحیح حدیث کا مطالبہ پورا کرنا پریشانی کا باعث بن گیا ہے اور صحاح ستہ سے رخصت لے کر ابن خزیمہ (بلکہ زیر ناف ہاتھ باندھنے والے حضرت سفیان ثوری) کے دروازے پر سائل بن کر کھڑے ہیں۔

وہاں سے حدیث ملی جس کی سند یہ ہے "......مؤمل بن اسمٰعیل نا سفیان عن عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل بن حجر رضی اللہ عنہ قال......"

اگر یہی سند احناف کی پیش کردہ کسی حدیث میں ملتی تو ہمارے یہ مہربان جرح کرتے ہوئے جامہ سے باہر ہو جاتے۔ کبھی مؤمل بن اسمٰعیل کے متعلق ذہبی اور ابن حجر وغیرہ کی کتابوں سے منکر الحدیث، سیئ الحفظ، کثیر الخطاء کے الفاظ دکھائے جاتے، کبھی سفیان ثوری، عاصم اور کلیب تین عراقی راویوں پر اجتماعی جرح کی جاتی "عراقی ہزار حدیث روایت کرے تو اُن میں سے نو سو نوے پھینک دیں اور جو باقی دس ہیں اُن کے بارے میں بھی شک میں رہو۔ (ضعیف اور موضوع روایات، از یحییٰ گوندلوی غیر مقلد، ص ۳۲)

کبھی سفیان ثوری پر جرح ہوتی کہ وہ مدلّس ہے اور یہاں عنعنہ سے روایت کر رہا ہے اس لیے روایت ضعیف ہے۔ (ہدیۃ المسلمین، از زبیر علی زئی، ص ۳۹)

کبھی عاصم بن کلیب کو اس روایت میں منفرد قرار دے کر حدیث کو ضعیف کہا جاتا۔

(ضعیف اور موضوع روایات، از یحییٰ گوندلوی، ص ۲۲۶)

کبھی کہتے کہ مؤمل کی حدیث ثوری سے ضعیف ہوتی ہے۔ (توجیہہ القاری، ص ۳۲۱ بحوالہ ابن حجر عسقلانی)

کبھی کہتے کہ ثوری کے شاگردوں کی پوری جماعت نے یہ حدیث بیان کی ہے مگر علیٰ صدرہ کے الفاظ سوائے مؤمل بن اسماعیل کے اور کسی شاگرد نے بیان نہیں کیے۔ (الخلافیات للبیہقی) لہٰذا ثوری کی اس روایت میں مؤمل بن اسماعیل کا یہ اضافہ غیر محفوظ ہے، شاذ ہے، مقبول نہیں ہے۔

روایت کا دارومدار صرف مؤمل بن اسمٰعیل پر نہیں تھا کہ اُس کے بارے میں چار پانچ شوشے چھوڑ کر حدیث کو صحیح ثابت کر دیا جائے۔

پہلا شوشہ یہ چھوڑا گیا کہ امام بخاری نے مؤمل بن اسمٰعیل کو منکر الحدیث ہرگز نہیں کہا۔ اس طرح ذہبی اور ابن حجر عسقلانی کی نقل کو چیلنج کر کے اُن کی ثقاہت اور صداقت کو مشکوک بنایا گیا تا کہ ذہبی اور ابن حجر کی باقی تمام باتیں بھی بے سروپا معلوم ہوں اور بنظر غور دیکھا جائے تو مؤمل بن اسمٰعیل کے لفظ ''اسمٰعیل''اور''سعید'' میں کاتب سے خطا ہوئی اور وہ لام کو دال کی شکل کا لکھ بیٹھا اور ہمارے ان نام نہاد محققین نے اُسی تصحیف کاتب والے نسخے کو شائع کر کے یہ قلعہ فتح کیا۔ اس کا ثبوت ابن حجر عسقلانی، علامہ ذہبی اور علامہ مزی کی گواہیاں ہیں کہ امام بخاری نے مؤمل بن اسمٰعیل کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ کیا یہ سب گواہ جھوٹے ہیں؟ پھر یہ کہ مؤمل بن سعید کے منکر الحدیث ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مؤمل بن اسمٰعیل منکر الحدیث نہیں ہے۔

دوسرا شوشہ یہ چھوڑا کہ امام بخاری اگر اسے منکر الحدیث کہتے تو بخاری کی تعلیقات میں اس کی حدیث نہ لے کر آتے۔ یہ شوشہ پہلے شوشے سے بھی کمزور ہے۔ کیا امام بخاری نے لکھا کہ یہ تعلیق میں مؤمل بن اسماعیل ہی سے لے رہا ہوں۔ سند تو بعد والوں نے ڈھونڈی۔ پھر کتنے ہی راوی ایسے ہیں جنہیں امام بخاری اپنی تاریخ کبیر اور صغیر میں ضعیف کہتے ہیں اور صحیح بخاری میں خود ہی اُس راوی سے روایت بھی لے رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً ابراھیم بن اسماعیل انصاری، ثابت بن محمد العابد، حریث بن ابی مطر کوفی وغیرہ، انہیں خود ہی امام بخاری ضعیف کہتے ہیں اور خود ہی صحیح بخاری میں ان سے روایت لیتے ہیں اور کسی بخاری پرست کو جرأت نہیں ہوتی کہ ان راویوں کے ضعف کو بخاری کی تاریخ میں پیوندکاری قرار دے سکے۔

تیسرا شوشہ یہ کہ مؤمل بن اسمٰعیل، وائل بن حجر کی اس حدیث میں منفرد نہیں کہ توقف لازم آئے، ہلب کی حدیث اس کی مؤید ہے۔ یہ شوشہ نہیں بلکہ اعتراف شکست ہے کیونکہ مؤمل بن اسماعیل کی انفرادی حدیث پر توقف مان لیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مؤمل بن اسماعیل کی یہ روایت ان کے نزدیک بھی قابلِ عمل نہیں۔

رہ گئی حدیث ہلب سے تائید تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اولاً تو اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اِدھر اُدھر سلام پھیرا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھا، ظاہر ہے کہ ہم نماز میں قیام کے وقت ہاتھ باندھنے کے مسئلے کی تحقیق کر رہے ہیں نہ کہ سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ باندھنے کی، کہ حدیث ہلب سے کام چلایا جا سکے۔

ثانیاً۔ حدیث ہلب میں سماک بن حرب جیسا راوی موجود ہے جس کے کمزور حافظے اور تلقین قبولی پر کافی کچھ کہا گیا، خود اس سے یہ حدیث لینے والے حضرت سفیان ثوری بھی سماک کو ضعیف کہتے ہیں۔ (کامل ابن عدی، ج ۳، ص ۱۲۹۹۔ احادیث صحیح بخاری و مسلم کو مذہبی داستانیں بنانے کی ناکام کوشش، از ارشاد الحق اثری، ص ۴۸)

ثالثاً۔اس حدیث کے دیگر راوی علیٰ صدرہ نہیں کہتے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تصحیف کاتب واقع ہوئی جس میں ھذہ کو صدرہ بنادیا گیا۔

رابعاً۔حدیث ھلب اور حدیث وائل بن حجر (بواسطہ مؤمل بن اسماعیل) دونوں روایتوں کا مشترکہ راوی سفیان ثوری نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کی بجائے زیر ناف ہاتھ باندھتا ہے۔ (نووی شرح مسلم، مغنی ابن قدامہ، جلد ۱، ص ۴۷۲)، اب اگر سفیان ثوری کو مخالفِ سُنّت کہا جائے تو اُس کی یہ دونوں روایتیں غیر معتبر ہوجائیں گی، اور اگر اُسے متبع سنت مانا جائے تو پھران روایات میں تاویل کرنا پڑے گی اور کہا جائے گا کہ راوی سفیان ثوری نے سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایت کو یا تو ضعیف اور یا پھر عورتوں کی تعلیم پر محمول کیا ہے، اس لیے خود ان پر عمل نہیں کیا۔

چوتھا شوشہ یہ ہے کہ چونکہ مؤمل بن اسماعیل کے لیے سئی الحفظ اور کثیر الخطاء کے الفاظ ملتے ہیں لہٰذا ایسے راوی کی روایت فی نفسہٖ حسن درجہ کی ہوتی ہے، حالانکہ ایسے راوی کی روایت ضعیف شمار ہوتی ہے اور اُس روایت کو فی نفسہٖ حسن کہنا کم علمی پر مبنی ہے (حدیث ھلب کی تائید کا تجزیہ اوپر ہوچکا)۔

پانچواں شوشہ کہ مؤمل بن اسماعیل کی تعدیل بھی تو کی گئی ہے، تو جواباً عرض ہے کہ مولوی سلطان محمود غیر مقلد آپ کے اصولِ حدیث میں لکھ چکا ہے کہ ''جب جرح مقبول اور تعدیل مقبول متعارض ہوجائیں تو اکثر ائمہ کے نزدیک جرح مقدم ہے۔'' (اصطلاحات المحدثین، مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان، ص ۲۰، ۲۱)، لہٰذا مجروح راوی کے بارے میں تعدیل کا قول آپ اہل حدیثوں کے کس کام کا ہے؟ پھر آپ کے رفع یدین وغیرہ کے سلسلے میں بیان کردہ متعدد اعتراضات بھی تو اس مؤمل والی سند پر بھی لاگو ہوتے ہیں، جنہیں ہم نے اوپر بیان کردیا اور جنہیں آپ دیگر مسائل میں قارئین پر پیش کرتے ہیں مگر اس مسئلے میں اپنے کمزور موقف کو بچانے کے لیے قارئین سے چھپاتے ہیں، کیونکہ وہ آپ کے اپنے ہی بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اس روایت کی سند کے عیب ہیں جن سے یہ روایت ضعیف ہوتی ہے اور اپنے مطلب کی روایات کے اس طرح کے عیب چھپانا مسلکِ اہلِ حدیث کا اس دور میں شعار بن چکا ہے۔

طرفہ تماشہ یہ کہ آپ سینے پر ہاتھ باندھنے کے لیے اس قدر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں مگر عملی طور پر آپ حضرات کی اکثریت سینے سے نیچے ہاتھ باندھتی ہے اور اہلِ حدیث حضرات کے ماہرین اناٹومی آج تک سینہ اور زیر سینہ کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کرسکے، لگتا ہے کہ ان کے سینوں نے پیٹ کے بالائی حصے پر ناجائز قبضہ کررکھا ہے۔

یہ قصہ لطیف ابھی ناتمام ہے　　　جو کچھ بیاں ہوا ہے یہ آغاز باب تھا

یار زندہ صحبت باقی

داتا

از: خلیل احمد رانا

لفظ "داتا" کا معنی ہے "دینے والا"، "سخی"

لفظ "داتا" کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوق پر بھی قرآن کریم سے ثابت ہے، شرک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا" (پ۱۶، سورۃ مریم، آیت ۱۹)

ترجمہ: (جبریل نے) کہا (اے مریم) اس کے سوا کچھ نہیں کہ مَیں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تمہیں پاک بیٹا دوں۔

حقیقت میں بیٹا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن جبریل علیہ السلام بیٹا دینے کی نسبت اپنی طرف کررہے ہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام کیونکہ اس دینے کا یا عطا کرنے کا سبب اور ذریعہ ہیں، اس لیے حضرت جبریل علیہ السلام نے مجازی طور پر بیٹا دینے کی نسبت اپنی طرف کردی۔ اس سے یہ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے اگر کسی نعمت کے ملنے کو اس وسیلہ یا ذریعہ یا واسطہ کی طرف منسوب کردیا جائے تو ایسی نسبتِ مجازی درست ہے، شرک نہیں، لیکن اعتقاد یہ ہو کہ حقیقت میں دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

اب دیکھیے کہ جبریل علیہ السلام کے لیے بیٹا دینے کی نسبت قرآن سے ثابت ہے یا نہیں؟ یقیناً ثابت ہے، تو یہ نسبت حقیقی ہے یا مجازی ہے؟ یقیناً مجازی ہے، کیونکہ جبریل علیہ السلام کے لیے حقیقت میں بیٹا دینے والا اعتقاد کرو گے تو مشرک ہو جاؤ گے۔

تو عزیز دوستو، بھائیو! مخلوق میں سے کسی کو مجازی طور پر داتا کہہ دینا شرک نہیں، بلکہ قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن سمجھنے اور قرآن پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی طرح لفظ "سخی" ہے کہ جب ایک غیر مسلم حاتم طائی کو سخاوت کی وجہ سے سخی کہہ سکتے ہیں، تو اللہ کی مخلوق میں سے کسی مسلمان کو مثلاً حضرت سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مجازی طور پر غنی اور سخی کہہ دینا کیسے شرک ہوگا؟ اسی طرح حضرت سیّدی علی ہجویری علیہ الرحمہ جو ایک صالح مسلمان ہیں، ان کو مجازی طور پر سخی کہہ دیا تو شرک کیسے ہوگیا؟ حقیقت میں غنی اور سخی اللہ ہی ہے۔ سیّد علی ہجویری علیہ الرحمہ کو داتا اور گنج بخش کہنا اگر شرک ہے تو سیّد اور علی بھی تو اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور اس کی صفت ہے۔

یاد رکھیے! انسان صفاتِ الٰہیت کا مظہر تو ہوسکتا ہے مگر صفتِ الوہیت کا مظہر ماننا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو رحیم، کریم کی صفت تو عطا کرسکتا ہے مگر کسی کو اِلٰہ نہیں بنائے گا، کیونکہ صفت الوہیت مستقل ہے، اس میں استقلال ہے، یہ کسی کو عطا نہیں ہوسکتی، مشرکین اپنے معبودوں میں صفتِ الوہیت کی عطا کے قائل تھے اسی لیے ان کی عبادت کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں۔

اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کی طرف عطا کرنے کی نسبت کرتے ہوئے فرمایا: **ولو انهم رضوا ما اٰتهم الله ورسوله وقالوا حسبنا الله سيوتينا الله من فضله ورسوله** (سورۃ توبہ، آیت ۵۹)

اللہ تعالیٰ نے غنی کرنے کی نسبت حضور نبی کریم ﷺ کی طرف فرمائی: **وما نقموا الا ان اغنٰهم الله ورسوله من فضله** (سورۃ توبہ، آیت ۷۴)

جب رسول اللہ ﷺ کے لیے دینا اور غنی کرنا ثابت ہے تو آپ سے لینا اور غنی کرنے کی درخواست والتجا کرنا بھی برحق ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **وما اٰتکم الرسول فخذوه وما نهکم عنه فانتهوا** (سورۃ الحشر، آیت ۷)

جو تمہیں میرا رسول دے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور جس سے منع کریں یا جو تم سے دور رکھیں اس سے دور رہو۔

اس آیت کریمہ میں دین و دنیا دونوں لحاظ سے عطا و منع اور امر و نہی کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے، کیا قرآن شرک کی تعلیم دے رہا ہے؟

"تنظیم اہل حدیث" کی سچی بات

"سیّد علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے دربار پر دنیا بھر سے زائرین آتے ہیں، پاکستان کا ہی نہیں غالباً یہ دنیا کی واحد ہستی کا دربار ہے جہاں ۲۴ گھنٹے لنگر جاری رہتا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ اس دربار سے کئی سفید پوش بھی لنگر لے کر اپنے بچوں کے پیٹ کی بھوک مٹاتے ہیں، یہاں پر بے پناہ عبادت بھی ہوتی ہے، اس قدر قرآن خوانی شاید ہی ملک کے کسی دربار پر ہوتی ہو"۔

(ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور، شمارہ ۱۰ ارمارچ ۲۰۰۰ء)

"بہارِ شریعت" تقاریظِ رضا کی روشنی میں

مولانا شکیل احمد قریشی اعظمی
امام مسجد غوثیہ بھابریکر نگر، چارکوپ، کاندیولی، ممبئی

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بہارِ شریعت صدر الشریعہ حضرت علامہ الحاج حکیم محمد امجد علی اعظمی رضوی قدس سرہ کی لاجواب و معرکتہ لآرا تصنیف ہے، فقۂ حنفی کا عظیم علمی شاہ کار ہے جو حضرت صدر الشریعہ کے تبحر علمی کی بیّن دلیل ہے اور ہر اعتبار سے لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ اہلسنّت و جماعت کے لیے عظیم ہدیہ و تحفہ ہے۔ ہمارے لیے عظیم سرمایۂ حیات کے ساتھ سرمایۂ افتخار بھی۔ خدا رحمت کرے صدر الشریعہ کی مرقدِ انور پر اور لاکھوں درود و سلام ہو اُن کے علمی و دینی و ملی و تعلیمی کارنامہ پر۔ بہارِ شریعت کی اہمیت و افادیت اور اس کی تصنیف و تالیف کے تاثرات حضرت ہی کے قلم و قرطاس سے سمجھتے چلیں تو بہتر ہے۔ حضرت صدر الشریعہ رقم طراز ہیں:

"فقیر پُر تقصیر ابوالعلا محمد امجد علی اعظمی عفی عنہ متوطن گھوسی محلہ کریم الدین پور ضلع اعظم گڈھ (مئو) عرض پرداز ہے کہ ضرورت زمانہ نے اس طرف توجہ دلائی کہ مسائلِ فقیہ صحیحہ و رجیحہ کا ایک مجموعہ اردو زبان میں برادرانِ اسلام کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس طرح پر کہ ہمارے عوام بھائی اردو خواں بھی منتفع ہوسکیں اور اپنی ضروریات میں اس سے کام لے سکیں۔ اردو زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی تھی جو صحیح مسائل پر مشتمل ہو اور ضروریات کے لیے کافی و وافی ہو۔ فقیر بوجہ کثرتِ مشاغلِ دینیہ اتنی فرصت نہیں پاتا تھا کہ اس کام کو پورے طور پر انجام دے سکے مگر حالتِ زمانہ نے مجبور کیا اور اس کے لیے تھوڑی فرصت نکالنی پڑی۔ جب کبھی فرصت ہاتھ آجاتی اس کام کو قدرے انجام دے لیتا۔ تدریس کی مشغولیت اور افتاء وغیرہ چند دینی کام ایسے انجام دینے پڑتے جن کی وجہ سے تصنیفِ کتاب کے لیے فرصت نہ ملتی مگر اللہ پر توکل کر کے جب یہ کام شروع کردیا گیا تو بزرگانِ کرام اور مشائخ عظام اور اساتذہ اعلام کی دعاؤں کی برکت سے ایک حد تک اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا نام "بہارِ شریعت" رکھا جس کے بفضلہٖ تعالیٰ سترہ حصے مکمل ہو چکے اور بحمدہ تعالیٰ یہ کتاب مسلمانوں میں حددرجہ مقبول ہوئی۔ عوام تو عوام اہلِ علم کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوئی۔ اس کتاب کی تصنیف میں یہی ہوا ہے کہ

ماہِ رمضان المبارک کی تعطیلات میں جو کچھ دوسرے کاموں سے وقت بچتا اس میں کچھ لکھ لیا جاتا یہاں تک جب ۱۹۳۹ء کی جنگ شروع ہوئی اور کاغذ کا ملنا مشکل ہوگیا اور اس کی طبع میں دشواریاں پیش آگئیں تو اس کی تصنیف کا سلسلہ بھی جو کچھ تھا وہ بھی جاتا رہا اور یہ کتاب اس حد تک پوری نہ ہوسکی جس کا فقیر نے ارادہ کیا تھا۔ بلکہ اپنا ارادہ تو یہ تھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اسی نہج پر ایک دوسری کتاب اور بھی لکھی جائے گی جو تصوف اور سلوک کے مسائل پر ہوگی۔ جس کا اظہار اس سے پیش تر نہیں کیا گیا تھا۔ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ چند سال کے اندر متعدد حوادث ایسے درپیش ہوئے جنھوں نے اس قابل بھی مجھے باقی نہ رکھا کہ "بہارِ شریعت" کی تصنیف کو حدِ تکمیل تک پہنچاتا۔

ایسی حالت میں بہارِ شریعت کی تکمیل میرے لیے بالکل دشوار ہوگئی اور مَیں نے اپنی اس تصنیف کو اس حد پر ختم کردیا گویا اب اس کتاب کو کامل و اکمل بھی کہا جاسکتا ہے مگر ابھی اس کا آخری تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ دو تین حصوں پر مشتمل ہوتا اگر توفیقِ الٰہی سعادت کرتی اور یہ بقیہ مضامین بھی تحریر میں آجاتے تو فقہ کے جمیع ابواب پر یہ کتاب مشتمل ہوتی اور کتاب مکمل ہوجاتی اور اگر میری اولاد یا تلامذہ یا علماے اہلِ سُنّت میں سے کوئی اس کا قلیل حصہ جو باقی رہ گیا ہے اس کی تکمیل فرمائیں تو میری عین خوشی ہے۔

فقیر امجد علی عفی عنہ

قادریہ منزل بڑا گاؤں گھوسی اعظم گڈھ یوپی

واضح رہے کہ بہار شریعت کے سترہ حصے (وصیت، مشمولات اٹھارہواں حصہ) فقیہ اعظم ہند بدر الطریقہ صدر الشریعہ لکھے کے ہوئے ہیں اور تین حصے آپ کے تلامذہ علامہ عبدالمصطفےٰ ازہری، مفتی وقار الدین، مولانا محبوب رضا بریلوی، علامہ سید ظہیر احمد زیدی، مفتی سید شجاعت علی وغیرہم نے یکے بعد اسی نہج پر تصنیف فرمائے۔ مولا تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے آمین۔

کسی بھی کتاب پر تقریظ کا لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ آج کل لوگ تصور کرتے ہیں اس لیے کہ تصدیق ونظرِ ثانی اور پھر تقریظ بڑا ہی مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ صاحبِ کتاب کے احوال کا علم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ پھر تصدیق پر مہرِ ثبت کیسے ہوگی۔ اور پھر صاحبِ کتاب سے کہیں زیادہ تقریظ ونظرِ ثانی کرنے والے کا بھی صاحبِ علم وفضل ہونا ضروری ہے جبھی تو وہ کتاب کے ہر سطور و قیل و قال، سوال و جواب، عقاید و نظریات، فضائل و مسائل کی صحیح ترجمانی فرمائے گا۔ اس لیے تقریظ وتصدیق کے بعد کتاب کامل و اکمل تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر چھوٹا اپنے بڑے کے پاس کتاب دکھانے کے لیے جاتا ہے تاکہ جو

کتاب میں کوتاہی و کمی بیشی رہ گئی ہو وہ حضرت کے دم قدم سے پوری ہو جائے۔ اس تناظر میں جب ہم سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی عملی زندگی دیکھتے ہیں تو ہزار ہا مصروفیات کے باوجود اس سلسلے میں چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور صاحب کتاب کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ یقیناً جن کتابوں پر امام احمد رضا کی نگاہِ کرم ہوجائے اور ساتھ ہی تقریظ کے ساتھ مہر ثبت ہوجائے وہ کتاب ہی لاثانی ہے۔ حضرت صدر الشریعہ اور ان کی کتاب ''بہارِ شریعت'' انھیں خوش نصیب لوگوں و کتابوں میں سے ہے جن پر اعلیٰ حضرت کی تحریر وقلم کے نقوش درخشندہ و تابندہ ہیں۔ وہ انمول موتی ہیں جو مشعلِ راہ و درسِ عبرت ہیں۔ بہارِ شریعت کے حصہ اوّل و دوّم پر تقریظِ اعلیٰ حضرت کے عکسِ جمیل کو دیکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

آبِ قلیان کی طہارت وطہوریت اور اس بارے میں کہ بحالِ ضرورت جب اور پانی نہ مل سکے اُس سے تکمیل لازم اور اس کے ہوتے تیمم باطل اور بلاضرورت بحال بدبو طہارت میں اُس کا استعمال ممنوع اور جب تک بو نہ زائل ہو نماز مکروہ اور مسجد میں جانا حرام۔ مولانا مولوی امجد علی صاحب قادری اعظمی سلمہ کی یہ تحریر صحیح اور اس کا خلاف جہل صریح یا عناد وقبیح جس سے اجتناب ہر مسلمان پر فرض قطعی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ

(بہارِ شریعت، حصہ دوم ص ۱۱۱، مطبوعہ فاروقیہ بکڈپو دہلی)

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ فقیر غفرلہ المولی القدیر نے یہ مبارک رسالہ بہارِ شریعت حصہ سوم تصنیف لطیف اخی فی اللہ ذی المجد والجاہ والطبع السلیم والفکر القویم والفضل والعلیٰ مولانا ابوالعلیٰ مولوی حکیم محمد امجد علی قادری برکاتی اعظمی بالمذہب والمشرب والسکنی رزقہ اللہ تعالیٰ فی الدارین الحسنٰی مطالعہ کیا الحمدللہ مسائلِ صحیحہ رجیحہ محققہ منقحہ پر مشتمل پایا۔ آج کل ایسی کتاب کی ضرورت تھی کہ عوام بھائی سلیس اردو میں صحیح مسئلے پائیں اور گمراہی و اغلاط کے مصنوع وملمع زیوروں کی طرف آنکھ نہ اُٹھائیں۔ مولیٰ عزوجل مصنف کی عمر وعلم وفیض میں برکت دے اور ہر باب میں اس کے اور حصص کافی وشافی ووافی وصافی تالیف کرنے کی توفیق بخشے اور انھیں اہل سنّت میں شائع ومعمول اور دنیا وآخرت میں نافع ومقبول فرمائے آمین۔ والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ وابنہ وحزبہ اجمعین آمین۔

۱۲ر شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ ہجریہ''

(بہارِ شریعت، حصہ سوئم ص ۱۵۴، مطبوعہ فاروقیہ بک ڈپو دہلی)

تصدیق جلیل وتقریظِ بے مثیل امامِ اہل سنّت ناصر دین وملت محی الشریعہ کاسر الفتنہ قامع البدعہ

مجدد المائۃ الحاضرۃ صاحب الحجۃ القاہرہ سیدی وسندی وکنزی وذخری لیومی وغدی اعلیٰ حضرت مولانا مولوی حاجی قاری مفتی احمد رضا خاں صاحب قادری برکاتی نفع اللہ الاسلام والمسلمین بفیوضہم و برکاتہم۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمدللہ و کفی سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ لاسیما علی الشارع المصطفیٰ ومقتفیہ فی المشارع اولی الطہارۃ و الصفا فقیر غفرلہ المولیٰ القدیر نے یہ مبارک رسالہ بہارِ شریعت تصنیف لطیف اخی فی اللہ ذی المجد والجاہ والطبع السلیم والفکر القویم والفضل العلیٰ مولنا ابوالعلیٰ مولوی حکیم محمد امجد علی قادری برکاتی اعظمی بالمذہب والمشرب والسکنیٰ رزقہ اللہ تعالیٰ فی الدارین الحسنیٰ مطالعہ کیا۔ الحمدللہ مسائلِ صحیحہ رجیحہ محققہ منقحہ پر مشتمل پایا۔ آج کل ایسی کتاب کی ضرورت تھی کہ عوام بھائی سلیس اردو میں صحیح مسئلے پائیں اور گمراہی و اغلاط کے مصنوع وملمع زیوروں کی طرف آنکھ نہ اٹھائیں۔ مولیٰ عزوجل مصنف کی عمر و علم وفیض میں برکت دے اور عقائد سے ضروری فروع تک ہر باب میں اس کتاب کے اور حصص کافی و شافی و وافی وصافی تالیف کرنے کی توفیق بخشے اور انھیں اہلِ سُنّت میں شائع ومعمول اور دنیا و آخرت میں مقبول و نافع فرمائے۔ آمین والحمدللہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولنا محمد و آلہ وصحبہ وابنہ وحزبہ اجمعین آمین۔ ۱۳ ربیع الآخر شریف ۲۵ھ ہجریہ''

(بہارِ شریعت ص ۱۶۰ حصہ چہارم)

بہارِ شریعت کی کامیابی وکامرانی کی ضمانت یقیناً تقاریظ رضا کے الفاظوں و جملوں میں بھی پوشیدہ ہے۔ گویا اعلیٰ حضرت کے مقدس کلماتِ تبریک سے مقبولیت و افادۂ عام میں چار چاند لگ گئے۔ بفضلہٖ تعالیٰ امام احمد رضا بھی عالمی شہرت وعالمی افادیت و اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ کتاب بھی عالمی افادیت کی عکاس اور تقریظیں سندِ زمانہ کی دال۔ تقاریظِ رضا میں ہم جب بنظر استحسان دیکھتے ہیں تو ان میں کچھ خاص چیزیں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ کہ تقریظ کی ابتدا بسم اللہ سے کرتے ہیں۔ ساتھ میں اللہ و رسول کی مزید حمد وثنا، پھر اپنی تواضع و انکساری و عجز اور پھر مصنف کے محامدِ کثیرہ حالانکہ خود اعلیٰ حضرت علم وفضل، عمل و زہد و تقویٰ، عشق وعرفان، صلۂ رحمی جود وسخا، حق گوئی وغیرہ کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ انکساری کا یہ عنصر تواضع کی بین دلیل ہے۔ پھر کتاب کی اہمیت و خاصیت، مذہب ومشرب کی نشان دہی کے ساتھ مصنف کی علمی وعملی کیفیت اور خاص عوامی صفات کو مدنظر وملحوظِ خاطر رکھا جو کہ درحقیقت تقریظ و تصدیق کے بنیادی عنصر ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تقریظ، تمہید و تصدیق حوالہ وغیرہ ہی کتاب کی اصل جان ہوا کرتی ہیں ورنہ آج کل تو کچھ تقاریظیں ایسی کتابوں پر لکھی جاتی ہیں کہ چند سطریں پڑھیں اور تقریظ لکھ دی کتاب کو از تو تا آخر پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے ہیں۔ لیکن محدث بریلوی کی ذات والا صفات اس

سے بری الذمہ نظر آتی ہے۔ آپ نے بذاتِ خود ان حصوں کا مطالعہ فرمایا جن حصوں پر تقاریظ بہارِ شریعت میں موجود ہیں۔ ہمارے یہاں تقاریظ پہلے باب میں شامل کی جاتی ہیں اگرچہ بعد میں لکھی جائیں لیکن اعلیٰ حضرت نے تقریظ بہار شریعت کے آخر میں بعض حصوں میں تحریر فرمائیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بعد مطالعہ ہی یہ تحریریں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے صدرالشریعہ کے ان علمی جواہر پاروں کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ کچھ حصے کانوں سے سماعت بھی کیے ہیں۔ صدرالشریعہ کی زندگی بریلی شریف میں امام احمد رضا کے ساتھ بیس سال گزری۔ ان کے روز و شب، جلوت و خلوت کا بھرپور معائنہ و مشاہدہ کیا تو ایسی حدیث وقرآن و مسائل و فضائل والی کتاب پر جو کہ فقہ حنفی کا علمی ذخیرہ ہے تقریظِ رضا و سماعتِ رضا کی بالخصوص ضرورت تھی۔ جن کے نوکِ قلم سے ہزار ہا علمی و دینی، مذہبی و لسانی، ثقافتی وفنی، سیاسی و سماجی نسخے وجود پذیر ہوئے جو کہ عاشقِ رسول و نائب رسول کے ساتھ سچے مذہبی پیشوا، روحانی مقتدا، حاملِ سُنّت و شریعت و طریقت و حقیقت و تصوف و سلوک جملہ محاسن میں ممتاز مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ لدنی اور خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس بارے میں فقیہ اعظم ہند لکھتے ہیں:

''اس کتاب (بہارِ شریعت حصہ پنجم و ششم) کی تصنیف شب بستم ماہ فاخر ربیع الآخر ۱۳۳۷ھ کو ختم ہوئی اور تھوڑے دنوں بعد امام اہلِ سُنّت اعلیٰ حضرت قبلہ قدس سرہ الاقدس کو سُنا بھی دی تھی۔ فقیر جب حرمین طیبین کو روانہ ہوا اس رسالہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا اور بمبئی کے ایک ہفتہ قیام میں مبیضہ کیا مگر اس کی طباعت میں موانع پیش آتے گئے۔ جن کی وجہ سے بہت تاخیر ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب طبع ہو گیا۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچائے اور ان صاحبوں سے نہایت عجز کے ساتھ التجا ہے کہ اس فقیر کے لیے ایمان پر ثبات اور حُسن خاتمہ کی دعا فرمائیں۔ اعلیٰ حضرت قبلہ قدس سرہ العزیز کا رسالہ ''انوار البشارۃ'' پورا اس میں شامل کر دیا ہے یعنی متفرق طور پر مضامین بلکہ عبارتیں داخلِ رسالہ ہیں کہ اولاً تبرک مقصود ہے، دوم ان الفاظ میں جو خوبیاں ہیں فقیر سے ناممکن تھیں لہٰذا عبارت نہ بدلی۔

فقیر ابوالعلا محمد امجد علی اعظمی عفی عنہ ۲۵ ررمضان المبارک ۱۳۴۱ھ ہجریہ''

(بہارِ شریعت ص ۱۳۰ حصہ ششم، فاروقیہ بک ڈپو دہلی)

یہ چند تقاریظِ اعلیٰ حضرت بیسوں حصے مل سکیں اگر ان کے علاوہ اور بھی ہیں تو کم علمی کی بنیاد پر تلاش نہ کر سکا۔ انھیں الفاظ پر مضمون ختم کرتا ہوں۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک اردو مخطوطہ میں ذکرِ رضاؔ

از: انوار محمد عظیم آبادی، پٹنہ

پیش نظر عنوان میں ''اردو مخطوطہ'' سے ہمارا اشارہ اس قلمی کتاب کی طرف ہے جو سیّد شاہ فضل امام واقفؔ اروِلی ثم آروی عظیم آبادی'' ۱؎ متولد ۱۹۱۶ء/ متوفی ۱۹۹۳ء کی یادگار ہے اور جس کا نسخہ ''نگارشاتِ واقفؔ'' کے نام سے بہ خط مصنف، کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔ کتب خانہ مذکور کے اس مملوکہ و مخزونہ فرمایشی مخطوطہ کا نمبر بالترتیب ACC4134، ACC 4144 تا ACC 4146 اور ACC 4952 تا ACC 4959 ہے۔ بیس ویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں، لائب ریری کے اُس وقت کے ڈائریکٹر جناب عابد رضا بیدار کی فہمایش پر شاہ فضل امام واقفؔ سے لکھوایا گیا، بارہ جلدوں پر مشتمل یہ مخطوطہ اگرچہ ''نگارشاتِ علامہ واقفؔ'' کے نام سے معنون و محفوظ رکھا گیا ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود حضرت واقفؔ اسے ''تاریخ تہذیب و تمدن عظیم آباد'' ۲؎ یا ''تاریخ تہذیب بہار و مملکتِ ہند'' ۳؎ یا ''اوراقِ پریشاں واقفؔ'' ۴؎ جیسا کوئی نام دینے کے خواہش مند تھے۔ اور اپنی اس علمی خدمت کے لحاظ سے خود کو'' وقائع نگار، مرقع نگار، شخصیت نگار، تذکرہ نگار، تاریخ نگار، روایت نگار، دیدہ نگار، شنیدہ نگار در خدا بخش لائب ریری پٹنہ'' ۵؎ شمار کرتے تھے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ''نگارشاتِ واقفؔ'' مصنف کی زندگی کے آخری دور کا کارنامہ ہے۔ اور اس میں تاریخ و تہذیب، شخصیات و نظریات اور تحریکات و واقعات کے تعلق سے بہت سارے موضوعات و مضامین زیر بحث آئے ہیں، لیکن یہاں فی الواقعہ اس مخطوطہ کی کیفیت و کمیت یا اُس کے مصنف کی زندگی کے حالات اور علمی و ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنا مطلوب نہیں بلکہ فی الوقت اس مخطوطہ کے تعلق سے جس پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دیگر موضوعات و مباحثات کے دوش بدوش جابجا حضرت شاہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز، اُن کے مشاہیر تلامذہ، بیس ویں صدی کے بریلوی مکتب فکر کے اکابر علما و شعرا اور ''بریلوی طرزِ فکر'' کی کام یاب نمایندگی کرنے والی عظیم المرتبت شخصیات کا تذکرہ حوالۂ قرطاس ہوتا رہا ہے۔ جو یقیناً بجائے خود بہت معلوماتی، دل چسپ اور کئی لحاظ سے پڑھنے اور غور کرنے کی چیز ہے۔ خصوصاً حضرت رضاؔ کے عہد، اُن کی زندگی اور اُن کے کارناموں سے متعلق جو سطریں لکھی گئی ہیں وہ بہرحال لایقِ مطالعہ ہیں۔ ان سطروں کی اہمیت اس اعتبار سے بھی مزید بڑھ جاتی ہے کہ شاہ فضل امام واقفؔ کو ایک ایسی بزرگ شخصیت کا پوتا ہونے کی سعادت حاصل ہے جو فاضل بریلوی کے

والد گرامی کے ہم درس رہ چکی تھی۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

''میرے دادا سید شاہ اطہر حسین، رئیس اعظم ارول، فاضل علومِ معقول و منقول بڑے زبردست جفار اور عامل بھی تھے۔ ۶...... اور چونکہ وہ فاضل بریلوی مولانا نقی علی خاں کے ہم درس رہ چکے تھے، اس لیے مولانا احمد رضا خاں صاحب، دادا مرحوم کی بڑی عزت کرتے اور اُن سے مربیانہ انداز سے ملتے تھے۔'' ۷

مزید برآں حضرت واقفؔ نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ:

''مولانا احمد رضا خاں بریلوی (قدس سرہٗ) میرے ہم عقیدہ بزرگ تھے۔'' ۸

اور شاید ان ہی باتوں کا اثر ہے کہ ''نگارشاتِ واقفؔ'' میں نہ صرف یہ کہ بریلوی مکتب فکر کے مشاہیر علما کا ذکر جابجا ہوتا رہا ہے بلکہ حضرت رضاؔ بریلوی کے والد گرامی ۹ اور خود حضرت رضا کا تذکرہ مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ کلمات صریح لکھا ہے کہ:

''خدا کی رحمتیں ہوں اُن پر، میں اُن سے عقیدت و محبت رکھتا ہوں، وہ بہت بڑے عالمِ اہل سنت والجماعت تھے، اُن کی خدماتِ دینی بے اندازہ ہیں۔'' ۱۰

پھر ایک مقام پر 'اکابر علمائے دیوبند' کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

''حضرت فاضل بریلوی، مولانا احمد رضا خاں مرحوم کا ذہن و فکر تو ان حضرات سے بالکل مختلف تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا شیفتگی، احترام و ادب ان کے مسلک کا امتیازی نشان ہے۔'' ۱۱

اسی طرح بعض مقامات پر حضرت واقفؔ نے امام احمد رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے، کلامِ اقبالؔ سے اُن کے بعض نعتیہ شعر کا ہم مضمون فارسی شعر پیش فرمایا ہے اور جہاں ایک طرف یہ بات لکھی ہے کہ:

''فاضل بریلوی ہر مسئلہ، ہر جملہ اور ہر فقرہ کو فقہی اور شرعی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔'' ۱۲

وہیں دوسری طرف یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

''مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعت گوئی بھی اردو زبان میں اپنا مقام رکھتی ہے...... اس میں اعتقاد یہ بھی ہے، جذبات بھی ہیں، ندرتِ مضمون بھی ہے، صفائی بیان بھی ہے اور حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کی مؤثر و دل نشین تصویر بھی۔'' ۱۳

اتنا ہی نہیں بلکہ ''نگارشاتِ واقفؔ'' میں حضرت رضاؔ کی زندگی کے بعض واقعات، علمائے فرنگی محل

کے تعلق سے فتاوے کا تذکرہ، ۱۵؎ اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے کے بعض معاملات کا ذکر بھی موجود ہے، مثلاً ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ:

"مولانا احمد رضا خاں اس تحریکِ ترکِ موالات کے مخالف تھے۔ وہ دو بنیادی باتیں ارشاد فرما رہے تھے کہ انگریزوں سے ترکِ موالات اور ہنود بالخصوص گاندھی جی سے موالات، یہ کیا ناشائستہ حرکت ہے۔ کفار سے موالات قیامت تک حرام ہے۔ ہندو ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا پارسی، یہودی ہوں یا مجوسی، مشرک ہوں یا دہریے۔ تم لوگ جو جی چاہے کرتے پھرو، مگر شریعت کی اصطلاح کو بازیچۂ اطفال نہ بناؤ...... اس مسئلہ میں بریلوی طرزِ فکر کی ترجمانی مولانا ظفر الدین ملک العلما نے کی تھی۔" ۱۶؎

حضرت واقفؔ کے اس بیان سے بلاشبہ اس بات کی بھی توثیق ہوتی ہے کہ حضرت رضاؔ کے فکری و اصلاحی مشن کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں، ان کے مشہورِ زمانہ بہاری شاگرد کا بہت ہی اہم حصہ رہا۔ واقعی یہ بہت ہی خوش گوار اتفاق ہے کہ حضرت رضاؔ کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی بھی مورخ اور سوانح نگار کے لیے صوبہ بہار سے حضرت رضاؔ کے ہمہ جہت تعلق کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ مثال کے لیے زیرِ بحث مخطوطہ پر ہی غور کیا جائے تو یہ کہے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ شاید یہ پہلا اردو مخطوطہ ہے جس میں حضرت رضاؔ، اُن کے والدِ گرامی اور اُن کے ارشد تلامذہ کا ذکر بار بار آیا ہے اور یہ مخطوطہ ایک بہاری ادیب و شاعر کے قلم سے، بہار کی سرزمین پر لکھا گیا اور بہار ہی کی راج دھانی پٹنہ میں واقع عالم گیر شہرت یافتہ لائبریری میں محفوظ ہے۔

یہاں حضرت رضاؔ کے تعلق سے اس مخطوطہ کے جو اقتباسات نقل ہوئے ہیں وہ اگرچہ بجائے خود، یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ حضرت رضاؔ سے حضرت واقفؔ کی "عقیدت و محبت" کچھ کم نہ تھی، لیکن زیرِ بحث مخطوطہ کی مزید ورق گردانی سے صاف صاف اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت واقفؔ بعض معاملات و مباحثات میں، مثلاً "نکتۂ استعانت" وغیرہ کی وضاحت میں حضرت رضاؔ اور بریلوی مکتبِ فکر کے اکابر علما کی باتوں سے بالکلیہ مطمئن نہیں بلکہ جابجا ان سے گہرا علمی اختلاف رکھتے ہیں۔ ۱۷؎ اسی طرح بعض مقامات پر، اپنی تحریر کے دوران حضرت واقفؔ نے ازراہ طنز و ظرافت جو اسلوب اپنایا ہے وہ بھی حد درجہ بے محل ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی تحریروں سے بسا اوقات ان کی ذہنی رو کے بھٹکنے اور اُس کی روشنی میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ "نگارشاتِ واقفؔ" کے بعض افکار و خیالات اور واقعات و بیانات کا ضروری علمی تجزیہ کیا جائے تاکہ مستقبل میں اس مخطوطہ سے استفادہ کرنے والوں کے لیے احتیاط کی راہ اپنانا آسان ہو جائے۔ یہاں یہ سطریں محض تعارفاً ہی لکھی گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خالص علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے

اس موضوع پر کام کرنے کی کافی گنجائش بھی ہے اور سنجیدہ علمی ضرورت بھی۔

حواشی

۱ و ۲ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4144 ص ۲۳۹
۳ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4134 روبروص ۶۸
۴ و ۵ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4952 ص ۱۶۳۰ و ص ۱۱۶۴
۶ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4134 ص ۲۲۰
۷ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4144 ص ۱۷۱
۸ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4953 ص ۲۱۳
۹ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4145 ص ۱۶۰
۱۰ و ۱۱ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4146 بالترتیب ص ۴۶۵ وص ۲۷۰
۱۲ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4953 ص ۲۱۶
۱۳ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4952 ص ۲۷ و ص ۲۸
۱۴ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4144 ص ۴۹۰
۱۵ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4952 ص ۱۱۹۴
۱۶ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4144 ص ۱۱۹
۱۷ نگارشاتِ واقفؔ ACC 4144 ص ۲۷۰ و ص ۲۷۱

OOOOOOOO

تعلیماتِ اولیا اور جدید دور

تقریر: بابا جی سیّد میر طیب علی شاہ بخاری

اللہ تبارک تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں جن کا احاطہ کرنا، گننا یا شمار کرنا انسان کے دائرۂ اختیار میں نہیں اور ایسی ہی بے بہا نعمتوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے اولیا ہیں جن کی صحبت اور مجلس میں بیٹھ کر ہم استفادہ حاصل کرتے ہیں، دنیا بھی بہتر کرتے ہیں اور آخرت بھی اچھی کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مَیں ابھی بیٹھا بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ ماشاء اللہ جتنے دوست یہاں ہمارے پاس بیٹھے ہیں تمام کے تمام مسلمان ہیں اور آج کل مسلمانوں کے زوال کے جو اسباب ہیں خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا عالمِ اسلام میں یا پوری دنیا میں اُس میں بہت بڑی وجہ آپس میں اتحاد نہیں ہے، تنظیم نہیں ہے۔ اس حوالے سے مَیں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت (کرماں والا) صاحب کے وسیلۂ جلیلہ سے، آپ کے توسط اور آپ کے نعلین کی خیرات سے کچھ باتیں جو مَیں پہلے بھی عرض کرتا رہتا ہوں کہ اس وقت ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتحاد ہے، اور اتحاد کے حوالے سے مَیں چار چیزیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تنظیم سازی کے لیے چار چیزوں کا ہونا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ ایک مشترکہ مقصد ہونا چاہیے، ایک مشترکہ مقصد Common Goal ہونا بہت ہی ضروری ہے اور بحمد للہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے پاس اگر کوئی مشترکہ مقصد ہے یا Common Goal ہے تو وہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ کریمانہ ہے۔ جس کے اوپر تمام اُمت مسلمہ اکٹھی ہوسکتی ہے۔ یہ پہلی بات ہوگئی۔ دوسری چیز جو اتحاد کے لیے ضروری ہے وہ ایک دوسرے کی شناخت اور ایک دوسرے کی پہچان ہے۔ یہ شعبہ جس میں بھائی چارہ، ایک دوسرے پہ اعتماد، ایک دوسرے سے محبت ایک دوسرے کے لیے درد ایک دوسرے کے لیے خلوص ہے، یہاں پہ آ کے ہم کہیں مار کھا جاتے ہیں۔ تیسری چیز جو تنظیم سازی کے لیے ضروری ہوتی ہے، اتحاد کے لیے ضروری ہوتی ہے، وہ ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور مَیں نے پاکستان میں اور مسلمانوں میں بالخصوص یہ دیکھا ہے کہ حوصلہ افزائی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تنقید میں ہم لوگ اس قدر ماہر ہیں، مَیں تو اکثر کہتا ہوں کہ ہمارے مختلف محکمے، مختلف Organizations (تنظیمیں) تنقید میں اتنی ماہر ہیں کہ بڑی بڑی تنظیم کی دھجیاں اڑانے میں دو منٹ لگاتے ہیں۔ بہت اچھا Skill (صلاحیت) ڈویلپ کیا (بڑھایا) ہوا ہے تنقید کا۔ اسی طرح اُمتِ

مسلمہ میں بھی یہ چیز ہے جو ہمارے لیے انتہائی مصیبت اور پریشانی کا باعث ہے۔ لہٰذا حوصلہ افزائی تیسری چیز ہے اور چوتھی چیز ہے Skills (صلاحیت)۔

Skills (صلاحیت) کو ابھارنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ ہم اپنے دینی علوم اور دینی عمل کے Skills (صلاحیتیں) اُبھاریں۔ اس کے بعد دنیاوی علوم، جدت، جدید علوم سیکھیں اور درجۂ کمال تک پہنچیں۔ اس کے بعد تبلیغ اور مبلغین کے لیے عرض کروں گا کہ رویے کا علم، Behavior (رویّہ) اور آپ کا اخلاق۔

مَیں نے دینی تنظیموں میں یہ فقدان دیکھا ہے کہ رویہ بہت خراب ہوتا ہے۔ تنقید سے ہم تبلیغ شروع کرتے ہیں۔ یاد رکھیں کبھی بھی کوئی تبلیغ تنقید سے فائدہ مند نہیں بنتی۔ یہ چار چیزیں ہیں، جب تک ہم ان کو بہتر نہیں کرتے اور ان میں Co-ordination (مطابقت) نہیں ہوتی، alignment (یکسانیت) نہیں ہوتی، ہماری تنظیم نہیں بن سکتی۔ ہم اللہ والوں کی درگاہ سے یہ چیز سیکھتے ہیں کہ کس طریقے سے ایک انسان جو کہ Dependent (ڈی پینڈنٹ) ہوتا ہے، جو کہ دوسرے کے انحصار پہ ہوتا ہے، لوگوں کا محتاج ہوتا ہے وہ کیسے independence (آزادی) حاصل کرتا ہے اور پھر وہ کیسے ایک دوسرے کے معاملات میں Inter Dependence حاصل کرتا ہے اور ایک دوسرے پہ انحصار کرکے ایک بہترین قوم بنتا ہے۔ اسی چیز کا فقدان ہماری انڈسٹریز کو ہے، اسی چیز کا فقدان ہمارے کاروباری حلقوں میں ہے، اسی چیز کا فقدان ہے کہ آجر اور اجیر میں بات نہیں بنتی۔ آج مالک اور ملازم کے درمیان آپس میں کوئی ذہنی Co-ordination (مطابقت) نہیں ہے اور اسی چیز کا فقدان علما میں بھی ہے کہ وہ جب تبلیغ کرتے ہیں تو ان کے پاس رویّے کا جو علم ہے یعنی اخلاق نہیں مگر وہ اقبال کا ایک شعر ہے ع

نگاہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز ☆ یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

جاں پرسوز نہیں ہے، نگاہ بلند نہیں ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ Co-ordination (مطابقت) نہیں ہے تو اس حوالے سے ہمیں جو تکالیف آرہی ہیں، اُس میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہمیں Trust worthy (قابل اعتماد) بننا ہے۔ یاد رکھیں Personal Level (ذاتی سطح) پہ ہمیں Trust worthy (قابل اعتماد) بننا ہے۔ اور قابل اعتماد بننے کے لیے دو چیزیں ہمیں چاہئیں۔ ایک تو ہمیں Character (کردار) چاہیے اور دوسری Competency (مہارت و قابلیت)۔ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوں گی تو ہم لوگ قابل اعتماد نہیں ہوسکتے۔ مثال کے طور پر بات کرتا ہوں کہ ایک حکیم صاحب بہت صاحب کردار ہیں، بہت اللہ اللہ کرنے والے ہیں، بڑا اخلاص ہے اُن کے پاس لیکن وہ Current (جدید) نہیں ہیں، Obsolete (پرانے خیالات والے) ہیں، اُن کے پاس

موجودہ دور کے نئے علوم نہیں ہیں، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے بالکل ہی کوئی واقفیت نہیں رکھتے اور وہ نہ تو کسی کا آپریشن کر سکتے ہیں اور نہ کوئی دوا دے سکتے ہیں۔ کیا ایسے معالج کے پاس علاج کے لیے اپنے بچے کو لے جائیں گے؟ بتائیں آپ؟ نہیں لے کر جائیں گے! دوسری طرف ایک ڈاکٹر صاحب جو بڑے Skilled (ماہر و قابل) ہیں لیکن بے کردار یا بدکردار ہیں تو ایسے شخص کے پاس کیا آپ اپنے مریض یا اپنے بچے کو لے جائیں گے؟ تو Trustworthy (قابلِ اعتماد) بننے کے لیے میں نے آپ کو پہلی چیز انفرادی طور پر، Personal Level (ذاتی سطح) پر بتائی۔ Current (جدید) ہیں، جو Obsolete (پرانے خیالات کے مالک) نہیں ہیں، بڑے

ہماری تبلیغ کیوں اثر نہیں کر رہی، اقوام عالم میں ہم کیوں ذلیل ہو رہے ہیں کہ ہم Trust worthy نہیں، قابل اعتماد نہیں ہیں۔ لہٰذا Personal Level (ذاتی سطح) پر ہمیں قابل اعتماد بننا ہے۔ اس کے لیے ہمارے کردار بہترین ہوں اور کردار کے ساتھ ہم Competent (قابل و ماہر) ہوں، ہم Current (جدید) ہوں، ہم Skilled (باصلاحیت) ہوں، ہم Honest (ایماندار) ہوں، ہماری Speed (آگے بڑھنے کی تیزی) ہو۔

اس کے بعد Inter Personal Level (اجتماعی سطح) پر ہمارا ایک دوسرے کے اوپر Turst (اعتماد) ہو۔ جیسے دیکھیں، دنیا میں لوگ کاروباری ترقی کر رہے ہیں۔ Joint Ventures (اکٹھے کاروبار کرنے کے معاہدے) ہو رہے ہیں۔ پچاس پچاس ہزار کی Franchise (کاروباری شاخیں) کھل رہی ہیں، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک بھائی کو دوسرے پر اعتماد نہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ لاشعور کی پروگرامنگ میں بے اعتمادی نقش ہو چکی ہے تو Inter Personal Level (اجتماعی سطح) پر ہمیں چاہیے کہ Turst (اعتماد) کو فروغ دیں اور ذاتی سطح پر قابل اعتماد بنیں۔

اس کے بعد ہے Managerial Level (انتظامی درجہ)۔ اس سے مراد ہے کہ جس طریقے سے ہمارے میاں چنوں کا بھی ایک انتظامی درجہ ہوگا۔ اس میں بھی ایک محکمہ مال ہوگا یا وکلاء ہوں گے یا عدالتیں ہوں گی۔ انتظامی درجہ ہوتا ہے Organizational Level (تنظیمی درجہ) جیسے ہمارا ملک پاکستان ہے، اُمت مسلمہ ہے جبکہ اس میں مطابقت نہیں ہے۔

ہمارا دین جس طریقے سے ہم تک پہنچا ہے، علما اُس طرح آگے نہیں پہنچا رہے تو یہ فقدان ہو گیا اور کچھ طاقتوں نے دین و دنیا کو جب Divide (تقسیم) کیا تو اس میں یہ انتہائی غلط قسم کی دو سوچیں آگئیں کہ کچھ دنیا میں اس قدر غرق ہو گئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو ہی بھول کر رہ گئے اور کچھ لوگ جو اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہیں وہ دنیا کے کسی معاملے میں اگر کوئی بھی پیش رفت کریں تو اُنہیں سمجھا جاتا ہے کہ شاید یہ

بالکل دین دار نہیں ہیں۔ یعنی مطابقت میں کمی آ گئی ہے۔ مَیں بار بار کہتا ہوں کہ یہ چار چیزیں اللہ والوں کے آستانوں سے ملتی ہیں، ہم وہاں جائیں، ان کی صحبت میں رہیں اور اللہ والوں کی درگاہوں کو یا اُن کی بارگاہوں کو فقط یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قبریں ہیں جہاں پہ جاکر سلام کیا جائے، فاتحہ خوانی کی جائے اور اپنے گھر کو آدمی چلتا بنے بلکہ اُن کے افکار سے، اُن کی شخصیات سے کچھ نہ کچھ سیکھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ذاتی اعتبار سے اپنے آپ کو Turst worthy (قابل اعتماد) ثابت کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری جب ہندوستان میں تشریف لائے ہیں Personal Level (ذاتی سطح) پر آپ نے اپنے آپ کو Trust worthy (قابل اعتماد) ثابت کیا، اپنے کردار سے اور اپنے Compentence سے۔ حالانکہ آپ عام لوگوں میں رہے لیکن ایسا کردار دکھایا، ایسا اخلاق دکھایا کہ لوگ وارفتہ آپ کے پاس آئے اور علم وحکمت کے ایسے موتی بکھیرے کہ تمام مکاتبِ فکر کے لوگوں کو اپنے فیوض و برکات سے مستفید فرمایا اور اللہ تبارک وتعالٰی سے دعائیں کر کر کے ان لوگوں کے معاملات کو درست فرمایا۔ ذاتی سطح پر یہ لوگ قابلِ اعتماد تھے اور Interpersonal Level (اجتماعی سطح) پر اپنے خلفا کو اپنے مریدین کو انہوں نے تیار کیا اور تیسرے درجہ یعنی انتظامی درجہ پر اداروں کو، تنظیموں، درس گاہوں اور یونیورسٹیز کو اس قدر بہترین بنایا کہ لوگ فقط ڈگری لے کر نہیں جاتے تھے بلکہ ساتھ میں صاحبِ کردار ہو کر جاتے تھے۔ آج کل پاکستان میں جو ڈگری کا ایک معیار ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ڈگری جس میں ایجوکیشن نہیں ہے، عام طور پر کسی آدمی سے پوچھا جاتا ہے جب اُس کی ذہانت کا اندازہ لگانا ہو تو پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے کیا ،کیا ہوا ہے۔ آپ نے گریجویشن کی ہے یا پوسٹ گریجویشن کی ہے۔ لیکن کبھی اُس کے ساتھ دو گھڑی بیٹھ کر یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس کو کتنا علم ہے اور علم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ عمل ہو۔ لوگوں کے قبلے کو اللہ والوں نے گنبدِ خضرٰی کی طرف موڑ دیا۔ مَیں آپ کو ایک بات بتاؤں! جو علم کتابوں میں ملتا ہے یہ فقط ایک خبر ہوتی ہے۔ اسے مَیں علم نہیں مانتا ہوں۔ میرا گمان یہ ہے کہ جسے لوگ علم کہتے ہیں وہ حقیقی علم نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وہ ہے جس سے بندہ راہِ راست پر آ جائے۔

مَیں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں، اگر آپ کے پاس تمام جہانوں کے نقشے موجود ہیں، تمام دنیا کے نقشے آپ کے پاس موجود ہوں اور پھر اگر آپ کو کسی جنگل میں پھینک دیا جائے تو کیا آپ صرف نقشے کے ذریعے وہاں سے نکل کر منزلِ مقصود پر جا سکتے ہیں؟ اسی لیے میں قطب نما کو بطور نشانِ منزل استعمال کرتا ہوں، میں قطب نما سے بے حد محبت کرتا ہوں، آپ دیکھیں، قطب نما کی سوئی ہمیشہ عین شمال کی طرف تکی ہوتی ہے، قطب نما کی سوئی ایک لوہے کی سوئی ہوتی ہے، اس کو آپ جنگلوں میں لے جائیں، اُسے ویرانوں میں لے جائیں، سمندروں میں لے جائیں، اس کو آپ فضا میں لے جائیں، اس کو خلا میں

لے جائیں، اس کو جتنی دفعہ بھی گردش دیں اس کی سوئی عین شمال کی طرف تکی رہتی ہے اور اگر ہم جنگل میں گم ہو جائیں یا ہم سمندروں میں گم ہو جائیں، اگر فقط اس سوئی کو جس کا رُخ، جس کا قبلہ شمال کی طرف ہے اگر اس کی پیروی کریں تو منزلِ مقصود تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اللہ والے وہ ہوتے ہیں جن کے دل کا قبلہ گنبدِ خضریٰ کی طرف ہوتا ہے لہٰذا آپ کو ایسے قطب نما تلاش کرنا پڑیں گے اور پھر ان کی اتباع کرنا پڑے گی۔ تو پھر اِن شاء اللہ بفضلِ خدا خواہ وہ ذاتی سطح ہو یا اجتماعی سطح، انتظامی سطح ہو یا تنظیمی ربط ہو، ان شاء اللہ بفضلِ خدا ضرور بہتر ہوں گے۔ مَیں پھر بار بار یہ بات کرتا ہوں کہ اللہ والے عام لوگوں میں پیدا ہوئے، دیکھیے انبیا علیہم السلام کی حیاتِ طیبہ کی طرف دیکھیے، نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی طرف دیکھیے، سرکار بہت بڑے بادشاہ کی طرح ایسے گھر میں پیدا نہیں ہوئے، جو ظاہری طور پر بہت طاقت ور یا بہت کچھ تھا۔ عرب بہت جاہل، ضدی قوم اور کچھ نہ ماننے والے اور توہم پرست، بتوں کو پوجنے والے، فلکیات، علمِ نجوم اور ستاروں کے علم پر یقین رکھنے والے، سرکار ﷺ نے اپنے کردار سے آہستہ آہستہ اُنہیں بدلا۔ اگر چاہتے تو آنِ واحد میں لوگوں کا قلب یا دل بدل رکھ دیتے لیکن سرکار نے قیامت تک اپنے آنے والے اُمتیوں کو یہ سبق دینا تھا کہ اس طریقے سے کام کرنا چاہیے۔ یہ قاید کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انتہائی مخدوش حالات میں سے نکل کر بہترین کام کر کے لوگوں کو دکھاتا ہے اور وہ لوگوں کے لیے صراطِ مستقیم کا راستہ دکھاتا ہے۔ آپ دیکھیے نبی کریم ﷺ نے جب تجارت فرمائی تو بہترین تجارت فرمائی، جب آپ کے معاملات اپنی زوجین کے ساتھ تھے تو بہترین معاملات تھے، آپ کی امانت داری کی بات تھی تو بہترین تھی، معاملے کی بات تھی تو بہترین تھی۔ تو سرکار کتنے باصلاحیت تھے ذاتی اعتبار سے اور ساتھ میں کردار سبحان اللّٰہ اور جو مخالف تھے وہ بھی صادق اور امین مانتے تھے۔ اس کے لیے سرکار ﷺ نے صبر و برداشت سے کام لیا۔ اس میں وقت لگا لیکن سرکار اعلانِ نبوت سے پہلے کفار کی نظر میں قابلِ اعتماد بن گئے، دیکھیے یہ ذاتی سطح ہے۔ ذاتی سطح پر سرکار قابلِ اعتماد بن گئے اور اس کے بعد اجتماعی سطح پر سرکار نے نبوت کا اعلان فرما دیا۔ بہت کم لوگ دائرۂ اسلام میں شامل ہوئے زیادہ تر لوگوں نے مخالفت کی لیکن ان لوگوں کی تربیت میرے آقا نے اس قدر فرمائی اور بتدریج انداز میں بلکہ سرکار کی اُمت کے اولیا کی یہ شان ہے کہ کسی کی طرف نظر ڈال دیں تو حافظِ قرآن بنا دیتے ہیں۔ سرکار چاہتے تو آپ کے قدموں کی برکات سے دنیا راہِ راست پر آجاتی لیکن سرکار نے بتانا تھا کہ مردیوں مہریں لگاتے ہیں جبین وقت پر اور سرکار نے بتانا تھا کہ کس طریقے سے محدود وسائل میں باطل کے اوپر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے سرکار نے تلوار نہیں نکالی اور ہمارا دین تلوار کے زور پر کبھی نہیں پھیلا۔ وہ تو بعد میں حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ کوئی اور چارہ نہیں تھا تو یہ سکھایا کہ جب حالات ایسے ہو جائیں کہ جب کوئی دوسرا چارہ نہ رہے تو پھر تلوار کو بھی نکالا

جاسکتا ہے۔ لہٰذا ذاتی سطح پر میرے آقا نے قابلیت وصلاحیت بھی دکھائی اور کردار بھی، تو کفار کی نظر میں بھی قابلِ اعتماد ٹھہرے۔ اس کے بعد میرے سرکار نے اپنے غلاموں کو اس قدر سبق دیے، ایسے بہترین اسباق دیے، ایسی بہترین تربیت دی کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم وجہہ الکریم رضی اللہ عنہ ہر معاملے میں سرکار ﷺ کی پیروی کرتے۔ اور یہ اعتماد کا ہی عالم تھا۔ دیکھیے اب اجتماعی سطح پر تنظیم بن نہیں سکتی جب تک اعتماد نہ ہو۔ آپ مجھے ذرا بتائیں کہ اپنے بھائی کو تھوڑے سے روپے دے کر اعتماد کرسکتے ہیں آج کل؟ نہیں کرسکتے! کیونکہ اعتماد نہیں ہے تو یہ قوم کیسے ترقی کرے گی !!! جبکہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے واقعۂ معراج کے بعد ابوجہل نے پوچھا کہ بتاؤ اگر کوئی کہیں چلا جائے اور کنڈی بھی ہلتی رہے اور بستر بھی گرم رہے اور تمام افلاک کی سیر بھی کی جائے تو کیا اس پر یقین کرو گے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، میں یقین نہیں کروں گا۔ لیکن جب سرکار کا نام آیا تو اعتماد کا یہ عالم تھا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو سرکار نے فرمایا مَیں نے سُنا یا نہیں سُنا، جو سرکار فرما رہے ہیں مَیں نے سُنا یا نہیں سُنا، جو سرکار فرمائیں گے میں نے سُنا یا نہیں، اس پر من وعن یقین رکھتا ہوں اور اسی طریقے سے یہ اعتماد کی فضا بن گئی۔

اب تیسرا درجہ تھا تبلیغ کا۔ اب تبلیغ دین ہورہی ہے۔ ہاں اس میں جراثیم بھی ہوتے ہیں، تنظیم میں جراثیم بھی ہوتے ہیں۔ منافقین جیسے جراثیم بھی تھے لیکن اُن کو نظر انداز کیا۔ انہوں نے بہت باتیں بھی کیں، بہتان بھی لگائے۔ لیکن نگاہ، تنظیم کی نظریں آپ دیکھیں کہ ایک ہی طرف ہیں، اب پتہ لگا انتظامی سطح ہے، لہٰذا احکامِ شریعت جو تھے اُن کو آہستہ آہستہ قرآن مجید کی شکل میں لوگوں کو بتانا شروع کردیا۔ اب قانون سازی ہورہی ہے، یہ انتظامی سطح پر اختیارات کی تقسیم ہورہی ہے، لوگوں کو طاقت دی جارہی ہے۔ آہستہ آہستہ شراب کو منسوخ کرنے کی آیات آئیں، پہلے اس کو منع کیا گیا کہ اس کے فواید کم ہیں اور نقصان زیادہ ہے، سود سے روکا گیا، ہماری معیشت کے اوپر بات کی جارہی ہے۔ سود کے ساتھ لوگوں کا استحصال ہوتا تھا، سود جو تھا معیشت کو منجمد کردیتا تھا۔ آپ جاکر دوسرے ممالک میں دیکھیں، جب (سودی) منافع کی شرح بڑھتی ہے تو معیشت منجمد ہوجاتی ہے اور اس کے بعد معیشت کو متحرک کرنے کے لیے آج کل کے ترقی یافتہ ممالک جو ہیں وہ (سودی) منافع کی شرح کو کم کرتے ہیں تو اس سے معیشت متحرک ہوجاتی ہے۔ تو پہلے ایسا بہترین ضابطۂ حیات دیا۔ ایسا ضابطۂ حیات کہ وہ دائرۂ اثر بن گیا تھا جو بہت تیزی سے پھیلا، گویا لوگوں کو ایسا لگا کہ اس کے بغیر ہمارا زندہ رہنا ہی محال ہوگیا۔ اب اس کو قانون سازی میں داخل کیا کہ یہ قانون ہوگیا، اب حدود اللہ آگئی تو یہ انتظامی درجہ تھا اور پھر تنظیمی درجے پر اولیا اللہ بنائے۔ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے پیغام کو لے کر جب تک

قیامت کا دن نہیں آجاتا آپ کے خدام ہیں ...... ولی اللہ ہیں ...... یہ کون ہوتے ہیں؟ اولیا اللہ کی کیا پہچان ہے؟ ابھی ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بلاشبہ اعلیٰ حضرت کرماں والے رحمۃ اللہ علیہ کے بغیر ایک قدم بھی میرا چلنا محال ہے، ایک قدم بھی اگر آپ کے در سے ہٹ کر چلیں تو وہیں ہلاک ہو جائیں۔ لیکن یہ اللہ والے کون ہوتے ہیں؟ مَیں پوچھتا ہوں آپ سے۔ اللہ والے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے خادم ہیں، یہ سرکار کے خادم ہیں، اس سے آگے ان کی کوئی پہچان نہیں۔ اور ان کا مشن کیا ہوتا ہے؟ ان کو کسی تخت پر بٹھادیں یا کہیں جوتیوں میں بٹھادیں، انہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ انہیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہیں آسمانوں میں اُڑادیں یا اُن کی گردن اتار دیں انہیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ان کا تو ایک ہی مقصد ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ ان کو تو تڑپ ہوتی ہے کہ لوگ سرکار کے دیوانے بن جائیں، سرکار کے اُسوہ پر چلیں۔ ہم نے دین کو فقط مسجدوں کی حدود میں بند کر دیا، حالانکہ دین تو بڑا وسیع تھا، دین میں تو معاملات بھی ہیں، دین میں اخلاقیات بھی ہیں، دین میں اُٹھنا بھی ہے، دین میں تو ظرافت بھی ہے۔ کسی جذبے کو دیکھیں۔ آپ تقابلِ ادیان کے موضوع کو پڑھ کر دیکھیں، دوسرے مذاہب ہیں، بدھ مت ہے، عیسائیت ہے، یہودیت ہے، ہندو ازم ہے، یہ مذاہب تو آپ کے قدرتی جذبے ختم کر دینے کا سبق دیتے ہیں لیکن اس دین نے تو کوئی جذبہ ختم ہی نہیں کیا۔ آپ شادی بھی کر سکتے ہیں، آپ کھیل کود بھی سکتے ہیں (شرعی قیود کے ساتھ)، آپ کاروبار بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کے جمالیاتی احساسات ہیں، مزاح کا احساس ہے، حدود و قیود میں رہ کر حسِ مزاح کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز کو ایک حد دے دی، ہر چیز کی اجازت دے دی، گویا یہ دین تو بہت آسان دین، بہت ہی قابلِ عمل دین ہے۔

جان لیں کہ ہمارا دین انتہائی آسان ہے۔ آپ ہنس کر اپنی بیوی سے بات کرتے ہیں یہ بھی دین ہے، آپ خوش اخلاقی سے تواضع کرتے ہیں یہ بھی دین ہے، ڈاکٹر اگر کسی مریض کا علاج کر رہا ہے تو یہ بھی دین ہے اور اگر آپ اچھے انداز سے کاروبار کر رہے ہیں تو یہ بھی دین ہے، اچھے انداز سے پڑھ رہے ہیں تو یہ بھی دین ہے، دنیا کے ساتھ سخت مقابلہ کر رہے ہیں یہ بھی دین ہے، اچھے سے اچھا کپڑا پہن رہے ہیں یہ بھی دین ہے، اچھی خوشبو لگا رہے ہیں یہ بھی دین ہے۔ ہمارا دین مشکل نہیں ہے، ہمارا دین گوشہ نشینی کا نام نہیں ہے، ہمارا دین اس چیز کا نام نہیں ہے کہ دنیا سے بالکل علیحدگی کر لی جائے۔ دین تو انتہائی آسان ہے لیکن ایک بات میں آپ کو بتاؤں کہ دین کی تبلیغ فقط ایسے لوگوں پر فرض نہیں ہے جنہیں آپ وارثانِ منبر و محراب کہتے ہیں، دین کی تبلیغ آپ پر بھی فرض ہے۔ اور مَیں آپ کو اپنا دل کھول کر کہتا ہوں کہ جب تک ہمارا مسلمان بھائیوں کا عام طبقہ جو عمومی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، جو مساجد اور مدارس سے تعلق بالخصوص نہیں رکھتا، جو لوگ اپنی عملی زندگی میں ہیں خواہ وہ کلاہ ہیں، ڈاکٹرز ہیں، بینکار ہیں، خواہ وہ طالب علم ہیں،

خواہ وہ اساتذہ ہیں، جب تک وہ اس دین کے لیے کوشش نہیں کریں گے ہمارا دین نہیں پھیلے گا اور کوشش کریں کہ تنقید والے جراثیم جو ہیں اُن سے بچا جائے تنقید والے جراثیم...... خواہ وہ کسی مسجد سے بول رہا ہے یا کسی مدرسے سے بول رہا ہے یا کسی حکومت سے ...... ایسے لوگوں سے اپنی جان چھڑائیں اور کوشش کریں کہ انتظامی درجہ میں ایسے لوگ ہوں جو ٹانگ کھینچنے کی کوشش نہ کریں جو استحصال نہ کریں بلکہ طاقت دے دیا کریں۔

مَیں حضرت کرماں والے رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں جاتا ہوں، وہاں پر بیٹھتا ہوں اور جو کچھ بھی مَیں عرض کررہا ہوں وہ انہی کے نعلین کے توسط سے مجھے ملا ہے۔ آپ بھی درگاہوں پر تشریف لائیں اور دل میں یہ گمان نہ رکھیں کہ درگاہوں پہ دقیانوسی باتیں ہوتی ہیں۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ دور کسے کہتے ہیں؟ زمانہ کسے کہتے ہیں؟ کسی نے کہا حرکتِ افلاک کا نام زمانہ ہے۔ افلاک...... زمین و آسمان کی گردش کا نام زمانہ ہے۔ لیکن یہ تو اشرف المخلوقات نہیں ہیں بھائی! زمانہ تو اشرف المخلوقات نہیں۔ یہ زمانہ، یہ گھڑیاں، یہ وقت، یہ ساعتیں جو بیت رہی ہیں یہ تو اشرف المخلوقات نہیں ہیں، یہ اعلیٰ نہیں ہیں، اعلیٰ تو انسان ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان نے اپنا تزکیہ نہ کیا۔ اور انسان فقط جسم کا نام نہیں ہے، اس کی بھی مَیں چار اقسام بیان کرتا ہوں۔ اب دیکھیں! انسان نام ہے جسم کا ...... یہ سب سے نچلی صورت ہے۔ اس کے بعد پھر ذہن آجاتا ہے۔ اس کے بعد پھر دل آجاتا ہے اور پھر روح ہے۔ جسم کو ہم نے درست کرنا ہے، جسم کی بیماریوں کو ختم کرنا ہے اور جسم کو تندرست کرنا ہے، اچھی جسمانی صحت ہمیں چاہیے پہلے نمبر پر۔ اس کے بعد ہمیں اپنے ذہن سے بھی کام لینا ہے، IQ (عقلی یا ذہنی معیار) بہتر کرنا ہے۔ IQ (عقلی یا ذہنی معیار) تیز ہونا چاہیے۔ IQ (عقلی یا ذہنی معیار) کیا ہے؟ دماغ کے اگلے حصے کی بائیں طرف سے IQ (عقلی یا ذہنی معیار) کا تعلق ہوتا ہے، اس سے تیزی طراری ہے، اس سے حساب و کتاب ہے۔ پھر ہمیں اپنے دل کو بھی درست کرنا ہے، اب دل میں کیا آتا ہے؟ جذبہ...... نفرت اور محبت، اللہ تبارک وتعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کی شان کے خلاف کوئی بات کرے تو نفرت کا جذبہ بھی چاہیے، وہاں نفرت ہونا بھی ایمان ہے اور جب میرے آقا کی اداؤں میں کوئی گم ہوجائے تو اس کے اوپر محبت سے نچھاور ہوجانا، یہ بھی ایمان ہے۔ تو قلبی طور پر انسان کو یہ چاہیے۔

مَیں اپنے بچے کو پچھلے دنوں ایک نصیحت کررہا تھا، مَیں نے کہا، بیٹے ایک بات بتاؤں تمہیں؟ کہتا جی! کیا۔ مَیں نے کہا، کبھی بے ضرر نہ رہنا۔ کہتا یہ کیا؟ مَیں نے کہا یہ بے ضرری بڑی موت ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت میں جو آدمی بے ضرر ہو، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اپنوں سے محبت کرنا اور اغیار سے کبھی کبھی نفرت بھی کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے دل بہت کھلے ہیں بحمد اللہ تعالیٰ۔

ہمارا پیغام محبت ہے لیکن اگر کہیں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کا ذکر آجائے، جو سرکار کے مخالف ہیں، ہم اُن سے نفرت کرنا بھی جانتے ہیں۔ جو بھی ہم پر فتوے لگ جائیں، جو بھی ہم پر باتیں ہو جائیں۔ اگر میرے آقا ﷺ کے ایک موئے مبارک کی شان میں بھی کوئی گستاخی کرے گا تو ہم اُس کو چھوڑیں گے نہیں۔ ہم نہ دنیا میں چھوڑیں گے نہ آخرت میں۔ اس لیے جو دل ہے اس کو بھی درست کرنا ہے اور یہ بات مَیں کررہا تھا کہ رویہ بھی دل سے ہے، روّیہ کیسا؟ عجز ایسا کہ جس میں خوشامد نہ ہو، خودی ایسی جس میں تکبر نہ ہو۔ اب دیکھیں! بات سنیں یہ ۴۵ منٹ یا ایک گھنٹے میں حضرت کرماں والا شریف کا تعارف تو نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے تو بار بار یہاں آنا پڑتا ہے۔ اب کہیں جی وہاں کیسے آئیں، وقت نہیں ہے۔ وقت نہیں ہے! تو وقت کو منظم کرنا بھی تو ایک خوبی ہے۔ سربراہِ مملکت کے پاس بھی چوبیس گھنٹے ہی ہوتے ہیں ایک دن میں اور ایک مزدور کے پاس بھی دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں، ٹھیک ہے ناں اور ایک جو غوثِ اعظم ہے یا غوثِ زماں ہے اس کے پاس بھی چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہمارے پاس وقت نہیں۔ بھائی! ترقی کیسے کروگے؟ کسی ایسے آدمی کے پاس بیٹھو جسے وقت کو منظم کرنا آتا ہو، جسے پتہ ہو کہ کم وقت میں کیسے زیادہ کام نکالتے ہیں۔ تو آستانوں پر تو آنا پڑتا ہے، اللہ والوں کے پاس تو بیٹھنا پڑتا ہے اور دیکھنا پڑتا ہے اُن کے مزاج کیسے ہیں! اب یہ دیکھیں ناں! بجلی سے فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ دیاسلائی سے دیکھیں روشنی بھی ہوتی ہے اور کبھی آگ بھی لگ جاتی ہے۔ اب دیکھنا پڑتا ہے، استفادہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ آستانوں پہ آنا چاہیے۔ یہ چیزیں سیکھنا چاہییں۔ مَیں بات بھول گیا ہوں، یہ دیکھیں یہ بھولنا...... بھولنے پہ کچھ اشعار یاد آرہے تھے، بھولنا بھی انسان کا ایک خاصہ ہے اور، دیکھیں کہ

آدم کی ایک لغزشِ پا کام آگئی ☆ ایسی ہوئی ہے بھول کہ دنیا سنور گئی

یہ دیکھیں کہ یہ انسان کا ایک خاصہ ہے۔ انسان بھول بھی جاتا ہے۔

چوتھی چیز ہے روح...... اور روح کا تعلق اللہ سے ہے۔ روح سلطان ہے اور روح کا تزکیہ بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے اعمالِ صالحہ ہیں اور خدمتِ خلق ہے۔ یاد رکھیں ایک بات...... مصلّے پر کھڑے ہوکر قیام و رکوع اور سجود کو فقط اللہ اللہ کا نام نہ دیں بلکہ اللہ اللہ کا بہت بڑا جُز جو ہے وہ خدمتِ خلق ہے۔ اور مَیں نے جو چیز تمام مکاتبِ فکر کے علما میں مشترک پائی ہے یہ ہے کہ وہ خدمتِ خلق، اخلاق، ورزش اور سادہ غذا اختیار کرتے ہیں۔ تو خدمتِ خلق جو ہے انتہائی ضروری ہے اور اس سے روح پاکیزہ ہوجاتی ہے۔ برد باری...... کسی کا اچھا چاہنا اور وقت کو منظم کرنے کے لیے خرافات سے بچنا۔ وقت ضائع نہ کریں، وقت قلیل ہے، وقت کم ہے اور روح کی پاکیزگی کے لیے اللہ والوں کے پاس جاتے ہیں کیونکہ یہ میرا ایمان ہے کہ بعض اوقات کسی اللہ والے کی ایک نظر سے بڑی بڑی پلید روحیں پاکیزہ ہوجاتی ہیں۔ تو بہرحال دورِ حاضر

میں اللہ والوں کے پاس جانا چاہیے۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص نے تو بورڈ لگا رکھا ہے کہ مَیں اللہ والوں ہوں۔ اللہ والے کو کیسے ڈھونڈا جائے؟ مَیں اپنے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ مَیں اللہ والوں کے نعلین کا، اُن کے پاس آنے والے خدّام کا ایک ادنیٰ نوکر اور غلام ہوں۔ اس سے بڑھ کر قطعی طور پر کچھ نہیں۔ اس میں کوئی کسرِ نفسی نہیں، یہ کوئی تجاہلِ عارفانہ نہیں بالکل سچی بات یہ ہے کہ اللہ والوں کے جو نعلین ہیں، جو اُن کے جوتے ہیں، اُن کو اٹھانے والا ہوں۔ اس سے آگے میری کوئی پہچان نہیں۔ لیکن اللہ والے کی جو پہچان ہے، مَیں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ ایک تو اس کا سلسلۂ طریقت صحیح ہو۔ سلسلۂ طریقت میں اس کو دیکھیں آپ۔ دوسرا آپ دیکھیں کہ وہ شریعتِ مطہرہ کا پابند ہو۔ تیسرا آپ دیکھیں اگر اس کا سلسلۂ نسب اچھا ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہے۔ تو یہ دو تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اس سے دیکھا جاتا ہے۔ مَیں نے تو جو اعلیٰ حضرت کے آستانے سے پایا ہے وہ کہیں اور سے نہیں پایا۔ یہی سچی بات ہے۔ مَیں بہت گھوما پھرا ہوں، بہت جگہ پر گیا آیا ہوں لیکن جو آپ کے آستانے سے پایا ہے، ہر طرح سے دیکھا ہے پھر بھی ابھی تک یہی پتہ چلا ہے کہ کچھ بھی پتہ نہیں۔ تو دورِ جدید میں ہمیں اللہ والوں کے پاس جانا چاہیے، اُن سے استفادہ کرنا چاہیے اور ان کو دقیانوس نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں کچھ علم نہیں یا اللہ والے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ روٹی کیسے کمائی جاتی ہے، اللہ والوں کو تو معیشت کا پتہ نہیں ہے، اللہ والوں کو تو تنظیم کا پتہ نہیں ہے، یہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی سے تعارف نہیں رکھتے۔ جو حکمت لفظ ہے ناں قرآن کا...... اس کا ایک معنیٰ قدیم اور جدید ہے۔ قدیم اتنا کہ تاریخ میں درج نہ ہو اور جدید اتنا کہ جتنی جدّت انسان کر ہی نہیں سکتا۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انداز کی کیا بات کی جائے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ میری باتیں سادہ سادہ ہیں لیکن نجانے کوئی عارف بھی انہیں سمجھ سکے یا نہیں۔ سادہ سی بات میں آپ بہت کچھ بتا دیتے تھے۔ اس طرح کی محافل ہونا چاہیے، اس طرح کی باتیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی اچھی بات لگے تو اُس کو کہیں چھاپ دیں' لکھ دیں، یہ باتیں آپ کے لیے ہدیہ ہیں، آپ کے لیے ہیں۔ اس کو استعمال کریں، یہ اپنی طرف سے تو ہیں نہیں جو بھی علم ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کے توسط اور آپ کے نعلین سے ملتا ہے اور جس آدمی کے کان میں پڑ جائے یہ اُسی کا ہے۔ وہ اسے بروئے کار لائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں آپ کو، ہم سب کو نبی اکرم ﷺ کی غلامی میں رکھے اور آپ کی غلامی میں کل قیامت والے دن ہمیں اُٹھائے۔ آمین وما علینا الا البلاغ المبین

(بشکریہ: ماہ نامہ مجلّہ "حضرت کرماں والا" آن لائن ایڈیشن، www.karmanwala.com)

اسلام میں جدّت پسندی

تحریر: جمال زار ابو زو
ترجمہ: مشتاق احمد ضیاء

جدت پسندی کیا ھے اور یہ کہاں سے آئی؟

نظریاتی طور پر ہم ان دنوں پھیلنے والی جدّت پسندی کی تحریک کو ماضی کے ایک فرقے کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں۔ اس فرقہ کو معتزلہ کہا جاتا ہے، جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری ہے۔ اگرچہ انہوں نے قرآن وسُنّت کو قبول کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ تاویل (تفسیر بالرائے) کو بھی اختیار کیا اور کہا کہ عقل کو نقل (رسول کی رہنمائی) پر فوقیت حاصل ہے۔ تاہم یہ گروہ اپنی موت آپ مرگیا۔ اگرچہ جدّت پسندی کی تحریک نے ان سے نشونما نہیں پائی لیکن موجودہ جدّت پسند ان سے بہت زیادہ مشابہ ضرور ہیں۔ اصل میں جدّت پسندی کی تحریک کی ابتدا (قرونِ وسطیٰ میں) یورپ میں ہوئی۔ اس وقت جب سائنسی طریق کار اسپین میں آیا تو دیکھا گیا کہ جو کچھ چرچ سکھا رہا ہے وہ غلط ہے۔ یہ چیز ہلکی سی بغاوت کا سبب بنی۔

جدّت پسندی کے حوالے سے (تمام مذاہب میں) بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہب کو حالات کے مطابق تبدیل ہونا چاہیے کیونکہ اس میں کوئی چیز بھی حتمی حقیقت کی طرح مستقل اور متعین نہیں ہے۔ یہودی اور عیسائی جدّت پسندوں نے یورپ کے جواب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ مذہب اب بھی لوگوں کے لیے کس طرح موقع محل کے عین مطابق ہے۔ انہوں نے لوگوں کی دلچسپی کو مذہب کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے نت نئی اختراعات کا سہارا لیا۔ (جیسا کہ چرچ میں گانا بجانا انیسویں صدی کے اختتام پر متعارف ہوا) انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کتابِ مقدس (بائبل) میں انسانی اور ربانی (کلام) یکجا ہیں لہٰذا وہ حصے جو بیچ ہیں انہیں غیر مروّج اور فرسودہ نہیں ہونا چاہیے۔ مذہب مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہو رہا ہے جبکہ کتاب مقدس میں کوئی چیز حتمی حقیقت کی طرح نہیں ہے۔ تاریخ میں یہ وہ وقت تھا جب بہت سے مسلمان یورپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس چیز نے ان مسلمانوں کے لیے تین راستے پیدا کر دیے کہ وہ مغرب کو قبول کریں' اسے رَدّ کر دیں یا دونوں کو جمع کر دیں (اسلام میں اصلاحات کا دروازہ کھول دیں)۔ جن (جدّت پسند) لوگوں نے تیسرے راستے کو اپنایا انہوں نے ترقی کی اور اپنی توجہ ترکی اور مصر کی طرف مرکوز کردی۔ ترکی اس وقت برطانیہ کے زیرِ اثر جبکہ الازہر اسلامی علوم کا مرکز تھا۔ جدّت پسندی کی اس تحریک سے وابستہ لوگوں نے اسلام کو اپنی عقل کے مطابق پرکھا۔ اس حوالے سے ان کی کچھ غلطیاں درج ذیل ہیں:

(1) عقل کو ان چیزوں کے لیے استعمال کرو جن کا ادراک اسلام نہیں کرسکتا۔

(2) ہر چیز کے لیے عقل کی طرف رجوع کرو' جو اس کے مطابق ہو، اسے قبول اور جو متعارض ہو اسے ردّ کردو۔

(3) وحی کو عقل کی کسوٹی پر پرکھو۔ تاہم اہلِ سُنّت و جماعت یہ یقین رکھتے ہیں کہ صحیح اور پختہ عقل کا استعمال اس نتیجے کا باعث بنتا ہے کہ قرآن اور رسول اکرم ﷺ حق ہیں اور ان کی تعلیمات کو عقل پر فائق ہونا چاہیے۔

امریکہ میں جدت پسندی کا اثر:

جدّت پسند کہتے ہیں کہ دنیا بدل چکی ہے لہٰذا اسلام کو بھی ''تہذیب یافتہ'' ہونا چاہیے۔ امریکہ میں جدّت پسندی بہت زیادہ پھیلی کیونکہ:

(1) امریکہ میں ایسے علما نہیں ہیں جو اس کے نظریات کو غلط ثابت کریں یا ہیں تو سہی لیکن وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے کیونکہ لوگ نہیں چاہتے کہ ان پر تنقید کی جائے۔

(2) جدّت پسندی مسلمانوں کے لیے اس امر کو ممکن بناتی ہے کہ وہ آئیں اور اپنی شناخت (مسلمان ہونا) ظاہر کیے بغیر امریکی معاشرے کا حصہ بنیں۔ مزید یہ کہ نئے امریکی مسلمانوں کو اپنا پرانا طرزِ حیات تبدیل نہیں کرنا پڑے گا۔

(3) امریکہ میں موجود بہت سا لٹریچر' علما اور ادارے جدّت پسندی پر مبنی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

تفسیر کے باب میں قرآن کریم کا سب سے مشہور مترجم یوسف علی بھی ہر اس چیز کا انکار کرتا ہے جس کا ادراک عقل نہیں کرسکتی۔ سیرت کی ایک کتاب کے مطابق رسول کسی بھی دوسرے بشر کی طرح ہوتا ہے جبکہ دوسرا یہ ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہے کہ سُنّت شریعت کے لیے (ماخذ) نہیں ہے' بعض اوقات ہمیں حدیث کو چھوڑنا پڑتا ہے کیونکہ اللہ نے حضور ﷺ کی اجتہادی خطاؤں کی اصلاح نہیں کی (معاذ اللہ)۔

فقہ میں جدّت پسند کہتے ہیں: سود جائز ہے' حائضہ عورت نماز پڑھ سکتی ہے اور مسلمان عورت غیر مسلم سے نکاح کرسکتی ہے' حضور ﷺ کے دور سے 150 برس بعد تک عورت کا چہرہ ڈھانپا نہیں جاتا تھا (حالانکہ یہ چیز تو آپ کے دور میں بھی موجود تھی)، عورت کو ہمیشہ مسجد میں نماز ادا کرنی چاہیے (حالانکہ حدیث میں خواتین کے مسجد میں جانے کا ذکر صرف فجر اور عشاء کی نماز کے وقت ملتا ہے کیونکہ تاریکی میں انہیں پہچانا نہیں جاسکتا)۔ حدیث ''لوگ عورت کی حکمرانی میں کامیاب نہیں ہوں گے'' آج صحیح نہیں ہے' تعدّدِ ازدواج ممنوع ہے سوائے مخصوص حالات کے (جو کہ موجود نہیں ہیں)۔ یہاں یہ بات ذکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ یہ تحریک نہ صرف منظم ہے بلکہ رسائل' ٹی وی چینلز' اجتماعات اور لٹریچر کی صورت میں اس کے پاس ذرائع بھی ہیں۔

جدت پسندوں کے کچھ نظریات:

جدّت پسند' لوگوں کی فکر کو متاثر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انجانے میں اُن کے نظریات کی ترویج میں حصہ لیا۔ ان کا اندازِ فکر ان کے لیے سب سے خطرناک چیز ہے۔ ان میں سے کوئی بھی عقیدے کے بارے میں بات نہیں کرتا کیونکہ ان کے نزدیک عقیدے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے (عقل نقل کو پرکھتی ہے) وہ سُنّت کو ختم کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ پرانے محدثین کا نظام ناکافی ہے۔ ان میں سے اکثر یہ کہتے ہیں (جیسا کہ کتاب مقدس کے نقاد کرتے ہیں) کہ ہمیں اعلیٰ ترین نقدِ حدیث کی ضرورت ہے اور علماے متقدمین کے نتائج (اجماع) ناکافی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے باوجود وہ حدیث کو پرکھنے کے لیے کوئی نیا طریقہ بھی نہیں بتاتے۔

ہم بحیثیت مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کو اللہ کی رہنمائی حاصل تھی۔ ہم حدیث میں موجود ہر چیز کو عقل کے ذریعے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ شریعت میں سُنّت کے کردار پر اعتراض کرنا جدّت پسندوں کے ہاں عام ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ سُنّت کا تعلق محض اس دنیا سے ہے اور یہ دین کا حصہ نہیں، حتیٰ کہ حضور ﷺ کے دور میں بھی۔ لہٰذا سُنّت تمام کی تمام مشاورت اور اجتہاد کا معاملہ ہے اور اب بھی قابلِ تبدیل ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے کہا کہ جس چیز کی پیروی کرنی ہے اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ زمان و مکان کی تبدیلیاں سُنّت پر عمل کو مشکل بنا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ سُنّت کی حیثیت کو کمزور کرنے کے لیے کہا جارہا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے انسانی اور ربانی (کلام) کے درمیان تفریق کرنے کی کوشش کی جبکہ جدّت پسندوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی بھی نبی کے انسان ہونے اور پیغمبر ہونے کے مابین فرق بیان کیا جائے۔ وہ پیغمبر کی زندگی کو مختلف حصوں (امام، جج، فوجی سربراہ اور پیغمبر) میں تقسیم کر کے سُنّت کی پیروی سے اجتناب کرتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ کچھ تعلیمات غیبی نہیں لہٰذا قانون ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر کوئی اجتہاد کرنے میں آزاد ہے' اس پر بندشیں بعد کے لوگوں نے لگائیں۔ ایک اور صاحب نے کہا حکمران تبدیلی کر سکتا ہے خواہ وہ چیز قرآن وسُنّت سے ثابت ہی کیوں نہ ہو۔

جدت پسند کیسے گمراہ ہوتے ہیں؟

کوئی بھی مشاہدہ کرنے والا بآسانی درج ذیل نکات کو اس رجحان کے اسباب قرار دے سکتا ہے:

(1) جدّت پسندوں کے جواز اور مفروضے غلط ہیں کیونکہ جدّت پسند مغرب کی طرف دیکھتے ہیں اور "قدیم مذہب" کی نئے دور اور جدید علوم کے ساتھ ازسرِنو تشریح وتوضیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ فرض کرتے ہیں کہ:

(ا) ''موجودہ صورتِ حال ترقی یافتہ اور مختلف ہے۔'' (یہ پیغمبر اسلام کا دور نہیں) حالانکہ ترقی اور موجودہ حالات کے بہتر ہونے کا تصور مارکس اور ہیگل کا نظریہ ہے جو کہ حدیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر نئی نسل بگڑ رہی ہے۔ انہیں ترقی کو ثابت کرنا چاہیے (ترقی کی تعریف ذکر نہیں کی

گئی) اسلامی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ معاشرہ وہ ہے جو اللہ سے زیادہ قریب اور اسلام کو بہتر انداز میں سمجھتا اور نافذ کرتا ہے۔ (جیسا کہ اصحابِ رسول نے کیا) حقیقت یہ ہے کہ موجودہ معاشروں کے پاس پرانے معاشروں کی چیزیں (مثلاً ہم جنسیت وغیرہ) ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

(ب) ''مذہب (کے سچا ہونے) کا تعلق زمان و مکان کے ساتھ ہے۔'' (یعنی اسلام کو جدید سائنس کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے)۔ جدت پسند ''سائنس دان'' ہیں اور اسلام کو جدید سائنسی علوم کے مطابق پرکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب کی بنیاد سائنس پر ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ سارے سائنسی علوم کی بنیاد حقائق پر نہیں۔ حقیقت میں سائنس کا بہت سا حصہ مفروضوں پر مشتمل ہے (حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) مزید یہ کہ ہر علم کا جداگانہ فلسفہ اور مختلف نتائج ہوتے ہیں۔

(ج) ''معاشرے کے اندازِ فکر کی بنیاد اس کے ماحول پر ہوتی ہے۔'' جدت پسند کہتے ہیں کہ مذہب کا بیشتر حصہ لوگوں سے حاصل ہوا ہے، جن کے ماحول اور احادیث کا تعلق صرف اس وقت سے تھا۔ جدت پسندوں کے پاس اس مفروضے کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ مذہب کے سچا ہونے کا تعلق زمان و مکان سے ہے۔ (نتیجے کے طور پر) ان کا کہنا ہے کہ قرآن اگر اب سچ نہیں ہے تو یہ کبھی سچ نہ تھا۔

(2) جو طریق کار وہ استعمال کرتے ہیں سراسر غلط ہے۔ جدت پسند اپنے طریق کار کی بدولت لوگوں کو غلط نتائج کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سائنسی طریق کار کے حامل ہیں لیکن ان میں عموماً یکسانیت کا فقدان پایا جاتا ہے' ان کے پاس اپنے نظریات کا کوئی ثبوت یا بنیاد بھی نہیں ہے۔

جدت پسند جو ذرائع اور اصول استعمال کرتے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :

(ا) جدت پسندوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اور مستند حدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے پاس حدیث کو جانچنے کا کوئی طریقہ ہے (جو اس سے مختلف ہے جو ہمارے روایتی علما کا ہے) لیکن ان میں سے اکثر حدیث کو پرکھنے کا کوئی نیا طریقہ بھی نہیں بتاتے بلکہ مستند حدیث کی تعیین کے لیے اپنی عقل استعمال کرتے ہیں (جیسا کہ خاتون حکمران کے بارے میں حدیث)۔ جدت پسند ان حدیثوں کو خصوصی طور پر ناپسند کرتے ہیں جو مخصوص معانی کی حامل ہیں اور ترجیح انہیں دیتے ہیں جو صرف عمومی ضابطوں پر مشتمل ہیں۔

(ب) جدت پسند اپنے نقطۂ نظر اور دلائل کی تائید میں غریب حدیث بھی استعمال کر جاتے ہیں (حالانکہ خود مستند حدیث کے استعمال کا مطالبہ کرتے ہیں) مثلاً اسلام میں عورت کے مقام کے حوالے سے دو جگہیں ایسی ہیں جنھیں جدت پسندوں نے بہت زیادہ تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے دو واقعات کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دورانِ خطبہ جہیز کی مقدار پر بندش لگانے کی کوشش کی اور ایک خاتون کے اختلاف کرنے پر آپ نے اپنی اصلاح کی

اور اس خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ام الشفا رضی اللہ عنہا کو بازار کے نگران کے طور پر متعین کیا۔ (یہاں جدت پسند کہتے ہیں کہ عورت حکومتی اُمور سرانجام دے سکتی ہے)۔ یہ دونوں واقعات غیر مستند ہیں۔

(ج) یہ لوگ مبہم اور غیر واضح اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جمہوریت' آزادی اور مساوات ایسی اصطلاحات استعمال تو کرتے ہیں لیکن یہ واضح نہیں کرتے کہ وہ انہیں کس مفہوم میں لیتے ہیں۔ اس نوع کی مبہم اصطلاحات استعمال کرنے سے ممکن ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص، ایک لفظ یا تصور کو یہ سوچتے ہوئے نظر انداز کردے کہ ان (جدت پسندوں) کی مراد اسلامی یا قابلِ قبول تعریف ہے حالانکہ حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہو جبکہ دوسری طرف ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں سچ ہے۔

(د) جدت پسند' موضوع سے متعلق قرآن و سُنّت وغیرہ سے دستیاب تمام معلومات فراہم نہیں کرتے بلکہ صرف وہ چیزیں پیش کرتے ہیں جو اُن کے نظریات کی تائید میں ہوتی ہیں۔ ناپسند نظریات سے بچنے کی خاطر ان (معلومات) کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا۔

(ہ) جدت پسند اپنی تشریح و توضیح کو متن پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی کام معتزلہ نے کیا تھا جب انہوں نے کہا کہ عقل' رسول اللہ ﷺ سے منقول ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ بہت سے جدت پسند کہتے ہیں کہ اسلام عقل و استدلال پر مبنی مذہب ہے۔ یہ درست ہے بشرطیکہ آپ کی مراد یہ ہو کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اس میں کوئی تناقض نہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ہم اسلام میں موجود ہر چیز کا مطالعہ' اسے محض اپنی عقل کے ذریعے جانچتے ہوئے' کرسکتے ہیں نہ صرف ناقابلِ قبول ہے بلکہ اسے کسی طرح سے ثابت بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن و سُنّت کی تعلیمات کے نفاذ سے بچنے کے لیے جدت پسند کہتے ہیں کہ ہمیں "روح اسلام" کی پیروی کی ضرورت ہے اور اس کے مخصوص قوانین کے بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ قرآن و سُنّت میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہمیں (اسلام کے ظاہر و باطن) دونوں کو اپنانا ہے۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن خواتین کو حیا والا لباس پہننے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن حجاب کی مخصوص تفصیلات کے بارے میں گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں محض اس قانون کی روح کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے۔

(و) جدت پسندوں کا میلان علما کی مخالفت کی طرف ہے۔ لیکن کہتے یہ ہیں کہ ان کی مراد کچھ اور ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ درِ اجتہاد کھلا ہے۔ اس بات کو کسی حد تک اہل سُنّت و جماعت بھی قبول کرتے ہیں لیکن درِ اجتہاد ہر موضوع پر ہر کسی کے لیے نہیں کھولا جاسکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر کوئی اجتہاد کرسکتا تھا لیکن امام شافعی نے شروطِ اہلیت کو سخت کردیا (یہ الزام سراسر غلط ہے) آج ہر کوئی اجتہاد کرسکتا ہے۔ ایک میگزین میں تعددِ ازدواج اور طلاق کے سوال پر ایک صاحب نے کہا کہ اجتہاد کے ذریعے ان دونوں پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔

یہ لوگ عموماً علما کی طرف غلط حوالوں کو منسوب کرتے ہیں اور ان کے اقوال کو اپنے معانی کا جامہ پہناتے ہیں۔

(ز) جدّت پسند عموماً عجیب وغریب اور ردّ کی ہوئی آرا کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ کچھ پرانی آرا کو پھر سے رواج دینے کے لیے کوشاں ہیں جو انہیں پسند ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نے ماضی میں یہ بات کہی تھی۔ وہ ان آرا کو ترویج دے کر ان چیزوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جن کی پیروی کرنا زیادہ آسان اور (اُن کے ہاں) مناسب ہے۔ تاہم ہمارے بارے میں قیاس یہ ہے کہ ہم ان فقہی آرا کی تلاش میں رہتے ہیں جو حقیقت کے قریب ترین ہیں۔ وہ عموماً موضوع احادیث لاتے ہیں جیسا کہ "میری اُمّت میں اختلاف رحمت ہے" یا مستند احادیث کو ردّ کرتے ہیں جیسا کہ اُمّت کے تہتر فرقوں میں تقسیم ہونے والی حدیث۔

(ح) جدّت پسند اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور عموماً بغیر کسی ٹھوس دلیل کے فیصلے اور فتاویٰ صادر کردیتے ہیں۔ جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا کہ موسیقی جائز ہے اور چونکہ مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی لہٰذا یہ حلال ہے۔ لیکن اس نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ قرآن و سُنّت نے اس موضوع پر کیا کہا ہے۔

اسلام اور جدّت پسندی:

اہلِ سُنّت و جماعت اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سچا اسلام صرف ایک ہے جو کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ایک حدیث کے مطابق صراطِ مستقیم حق (اللہ) کی طرف لے جاتا ہے جبکہ دیگر تمام راستے باطل کی طرف لے جانے کا باعث ہیں۔ مزید یہ کہ اُمّت تہتر فرقوں میں بٹے گی اور سچا فرقہ وہ ہوگا جو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کی پیروی کرے گا۔

جدّت پسند اہلِ سُنّت و جماعت سے درج ذیل امور میں اختلاف کرتے ہیں:

(1) ہر وہ چیز جو قرآن و سُنّت کے مطابق ہے حق ہے، جبکہ اس کے برعکس باطل ہے۔ نیز وہ اقوال بھی قابلِ قبول ہیں جو قرآن و سُنّت کے مطابق ہیں۔ (بعض جدّت پسند اس کلیے سے متفق نہیں)

(2) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (اور علمائے متقدمین) کا اجماع تمام مسلمانوں کے لیے حتمی طور پر ثابت ہے۔ جدّت پسند کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہماری طرح بشر تھے لہٰذا ان کے ہاں متفق علیہ اُمور پر بھی اجتہاد ہوسکتا ہے۔

(3) عقل، استدلال، رائے یا قیاس کے ذریعے قرآن و سُنّت میں موجود کسی چیز کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ اس امر کی تائید قرآن میں بھی ہے لہٰذا اس پر گفتگو یا رائے شماری نہیں ہوسکتی۔ لیکن ایک جدّت پسند نے کہا کہ چور کا ہاتھ کاٹنا "خمینی اسلام" اور غیر اخلاقی ہے۔

(4) اسلام میں عقیدہ وعبادت وغیرہ سے متعلقہ کچھ چیزیں نہ صرف مستقل ہیں بلکہ تمام ادوار و مقامات کے لیے صحیح، مناسب اور درست ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو اہلِ سُنّت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن بہت سے جدّت پسند

نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب کے سچا ہونے کا تعلق زمانے سے ہے اور کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔
یہ مستقل اصول اہل سُنّت کے بنیادی اور نمایاں پہلو ہیں۔ اور قرآن و سُنّت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (کی زندگیوں) میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ نہ تو قابلِ اعتراض ہیں اور نہ ہی قابلِ تبدیل۔ جدّت پسند کہتے ہیں کہ ان جیسی بہت سی چیزوں میں ہمیں اجتہاد و تجدید کی ضرورت ہے۔

خطرات:

(1) بہت سے لوگ نہ جانتے ہوئے بھی جدّت پسندی سے متاثر ہیں۔ چونکہ اس کے نظریات ناقابلِ قبول ہیں لہٰذا ان کی تردید ہونی چاہیے۔

(2) اکثر لوگ جدّت پسندی کو منکر یا بدعت کی تحریک کے طور پر تسلیم نہیں کرتے اور تحریروں اور تقریروں سے اس کی پہچان بھی نہیں کر پاتے لہٰذا اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اکثر تحریروں کا تعلق عقل و استدلال سے ہوتا ہے (جس کا کوئی نتیجہ اور انجام نہیں)۔ جدّت پسندی کے اثرات عیسائیوں کے چرچ میں نظر آتے ہیں (وہ یہ ہے کہ اب ان کا نہ تو مذہب سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی عملی اقدار یا مقصود ہے)۔

(3) یہ گروہ بھی غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور اس پر خوش بھی ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلم خواتین کو ان کے گھروں سے باہر لایا جائے تاکہ انہیں تبدیل کیا جاسکے۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران اسلام میں عورت کے مقام پر استعماری اور استشراقی نظام کے حملے دیکھے جاسکتے ہیں۔ (تاکہ اسے اور اسلامی معاشرے کو تباہ کیا جاسکے)

نتائج:

(1) مجموعی طور پر جدّت پسند تحریک بدعات میں سے ہے (خواہ اس کی بنیاد کسی چیز پر بھی ہو) ان کے اپنے اصول و اطوار ہیں جو کہ اہل سُنّت سے قطعاً مختلف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم دین کے ان بنیادی اصولوں میں اجتہاد چاہتے ہیں جو مستقل ہیں۔

(2) وہ اصحابِ رسول کے بالکل واضح معاملات پر اجماع کو رد کرنا چاہتے ہیں (جیسا کہ زناکار کا رجم اور مرتد کا قتل)۔ احادیث سے اس قسم کا سلوک کرتے ہیں گویا کہ ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں (عورت کی حکمرانی والی حدیث عام ہے)۔

(3) جدّت پسندی کا ایک بنیادی نقطۂ نظر عورت کے کردار کو تبدیل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مردوں عورتوں کا گھل مل کر رہنا اور عورتوں کے لیے حجاب نہ پہننا جائز ہے۔ جدّت پسند مغرب سے متاثر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے نتائج ہمیشہ مغربی نظریات کے مطابق ہوتے ہیں۔

(Translation of :"Modernism in Islam" Al-Da'awa (Saudi Arabia) March, 2004)

حجاب اور تہذیبی و ثقافتی دہشت گردی

محمد اسماعیل احمد بدایونی

شعبۂ قرآن وسنۃ ، کراچی یونیورسٹی

ismailromi@yahoo.com

ہاں بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل گیا۔ اقوام و مذاہب عالم کے سمندروں میں طوفانِ حوادث نے تباہی و بربادی مچائی ہوئی ہے۔ عمل اور انکشاف کی دنیا میں ایک ہیجان برپا ہے۔ موت وحیات کی کشمکش شروع ہوگئی ہے۔ مظالم، ناانصافیاں، دہشت گردی، خونی ہنگامہ آرائی مشرق کو مغرب میں تبدیل کرنے کے لیے پنجہ آزما ہورہی ہیں۔

ہاں ایک شور اور ایک طوفان ہے جو پاکستان، ایران، امریکہ، فرانس اور یورپ میں اُٹھ رہا ہے اور شمال کو جنوب اور جنوب کو شمال اور مشرق کو مغرب بنانے کے در پے ہے۔ صدیوں کے بعد اب شہادت گاہیں سنسان مقامات پر قائم ہوگئی ہیں۔ دار و رسن کی خونی اور وحشیانہ نمائش گاہیں سرِ بازار کھل گئیں ہیں۔ جانوں کی قیمت اور خون ریزی کے بازار بھی سجا دیے گئے ہیں۔ اہلِ اسلام کا خون پانی سے بھی زیادہ سستا ہو چکا ہے۔ سولی پر چڑھی ہوئی لاشیں یہ صدائیں لگا رہی ہیں:

''اے اسلام کے نام لیواؤ! اے روضۂ رسول کے پاسبانو! خوابِ غفلت سے جاگو۔ کیا دیکھتے نہیں آج مغرب نے کمر باندھی ہے کہ ممالکِ اسلامیہ کو نیست و نابود کردے۔ ان کی تہذیب وتمدن کے سوتے خشک کردے۔ ان کو ان کی اسلامی اقدار سے دور کر کے ان کو اپنے جیسا وحشی بنادیں۔''

عزیزانِ گرامی! اسلامی تہذیب وثقافت سے کسی کا کیا جاتا ہے جو وہ اس کے در پے ہیں۔

اگر مسلمان عورت خود کو حجاب میں محفوظ تصور کرتی ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ اور اگر عیسائی نن اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے اسکارف سر پر لینے پر آزاد ہے تو باپردہ عورتوں کو مطعون کیوں کیا جاتا ہے؟ ان پر کفن پوش، دقیانوسیت کی پھبتیاں کیوں کسی جاتی ہیں؟ میڈیا کے ذریعے ان کی ثقافت پر طعن وطنز کے تیر کیوں برسائے جاتے ہیں؟

کیا ان خواتین کو جینے کا کوئی حق نہیں......؟

ذرا سوچیے !!! یہ یہود و نصاریٰ کیوں اسلامی تہذیب وثقافت کو کچلنے کے در پے ہیں۔

دوستو ! اور ساتھیو! یہ آج صرف کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں، یہ پورے عالمِ اسلام کا مسئلہ ہے۔

اس مسئلے سے پورا عالمِ اسلام دوچار ہے۔

مصر میں حجاب کی مخالفت:

مصر میں ترقی و روشن خیالی کے داعی قاسم امین نے آزادیٔ نسواں کے حق میں ایک کتاب ۱۸۹۹ء میں "تحریر المرأة" کے نام سے شائع کی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام میں بے پردگی کی مخالفت نہیں۔

اس کتاب نے مصر کی اسلامی تہذیب و ثقافت کو برباد کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟ اسکندریہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین اپنی کتاب "التجاهات الوطنية في الاداب المعاصر" میں لکھتے ہیں:

"اس دعوت و تحریک کے نتیجے میں عورتوں میں بے پردگی اور بے حجابی آزادی و بے قیدی کا جو رجحان پیدا ہوا اس سے اسلامی خیال کے لوگ گھبرا گئے۔ عورتوں کے خیالات میں جو انقلاب آ رہا تھا قدیم آداب و رسوم، باپ اور شوہر کے اقتدار کے خلاف بغاوت کا جو جذبہ پیدا ہو رہا تھا' اس کو انہوں نے شدت سے ناپسند کیا۔ وہ استعجاب اور پریشانی کے عالم میں لباس کی تبدیلیوں اور تیزی کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے اور ساتر مصری لباس کے مقابلے چست و کوتاہ مغربی لباس کو دیکھ رہے تھے جو اس تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا تھا کہ جس کا ان کو پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔"

("مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش"، از ابوالحسن ندوی صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷ ناشر، مجلس نشریاتِ اسلام۔ بحوالہ الاتجاہات الوطنیۃ فی الادب المعاصر، ج ۲ صفحہ ۲۳۵)

افغانستان میں حجاب کی مخالفت:

۱۹۶۰ء سے قبل افغانستان میں اسلامی ثقافت اپنی آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ حجاب کا باحیا تصور یہاں موجود تھا۔ لیکن اسلامی تہذیب و ثقافت کے دشمنوں کی آنکھ میں گلستانِ خار بن کر چبھنے لگا اور انہوں نے اس چمن کو روند ڈالا۔ ٹائمز آف انڈیا (Times of India) کا یورپین نامہ نگار رچی کولڈر Ritchie Colder جس نے ۱۹۶۳ء کے افغانی جشنِ استقلال میں شرکت کی تھی، اس اخبار کی ۲۸/ جولائی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"تین سال قبل یہاں (افغانستان) کی عورتیں پردہ میں تھیں، اس وقت اگر ایسے مواقع پر اسے باہر نکلنے کی اجازت ملتی بھی تو اسے چادر میں ملفوف ہو کر آنا پڑتا جو اسے سر سے پیر تک ڈھکے رہتی اور نقاب اس کے چہرہ کو ڈھانپے ہوئے ہوتی جس میں دیکھنے کے

لیے سوراخ بنے ہوتے۔

اب یہ سب نذرِ انقلاب ہو چکا ہے۔ اب بھی جشن کے مجمع میں ایسی عورتیں خاصی نظر آتی ہیں جو اب الگ تھلگ رہنے والا برقعہ پہنے ہیں۔ وہ ابھی اس کی خوگر نہیں ہوئی ہیں لیکن ان کو اپنا چہرہ کھلا رکھنے کی آزادی نصیب ہو چکی ہے اور اب عورتوں کی عظیم اکثریت بے نقاب ہو چکی ہے۔"

(''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش'' صفحہ ۳۵ بحوالہ ٹائمز آف انڈیا)

بخارا میں حجاب کی مخالفت:

عورتوں کو گمراہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ حجاب شکنی پر زور دیا گیا اور تمام تر توانائیاں پردے کو ختم کرنے کی کوشش میں کی گئی کیونکہ سب سے پہلے نظر بہکتی ہے پھر دل بہکتا ہے اور پھر نفس بہکتا ہے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کو صرف مصر اور افغانستان میں ہی کچلا نہیں گیا بلکہ بخارا میں بھی مغربی تہذیب کے نفاذ کی کوشش کی گئی۔

بخارا کے اندر جب روسی کیمونسٹ داخل ہوئے تو انہوں نے بناتِ اسلام کے سروں سے چادریں کھینچی، ان کی عزت و آبرو کے گوہر کو لوٹا اور اس کے لیے انہوں نے معاشرے میں بگاڑ کے لیے ایسے ہتھکنڈے اپنائے کہ یہ نادان لڑکیاں ان کے جال میں پھنستی چلی گئیں۔

بخارا کی سڑکوں پر برقعوں کو جلایا گیا اور جن غیرت مند خواتین نے برقعے اتارنے سے انکار کیا ان کے سروں سے زبردستی برقعے نوچ لیے گئے۔

بخارا کا انقلابی شاعر تاق ابوالقاسم لکھتا ہے:

عیب باشد کہ تو در پردہ و خلقے آزاد
حیف باشد کہ تو در خواب و جہانے بیدار
ترک چادر کن مکتب برو درس بخوان
شاخہ جہل ندارد ثمرے جز ادبار

کتنی بری بات ہے کہ تم پردے میں ہو اور دنیا آزاد ہے افسوس کے تم محو خواب ہو اور دنیا بیدار ہے چادر چھوڑو مکتب جاؤ اور تعلیم حاصل کرو۔ جہالت کی شاخ پر پسماندگی کے سوا کوئی پھل نہیں لگتا۔

(''اُف یہ پادری'' ص ۳۳۷ بحوالہ عبرت نامہ بخارا)

افغانستان کے ہمسایہ ملک بخارا میں ۱۸؍ مارچ ۱۹۲۱ء کو ایک بڑی تقریب میں برقعوں کا ڈھیر نذر

آتش کر دیا گیا۔ پردہ ترک کروانے کے لیے مسلمان عورتوں پر تشدد سے بھی کام لیا گیا۔ اس تقریب میں پانچ ہزار مسلمان عورتیں آئی تھیں۔ جنہوں نے مزاحمت کی اور پردہ ترک کرنے سے انکار کیا ان کے سروں سے برقعے نوچ کر الاؤ میں ڈال دیئے گئے۔ رشتہ داروں کی منت سماجت اور ترغیب سے بالآخر انہیں بے پردگی اختیار کرنا پڑی۔

جبراً پردہ اتارنے کی مہم روسی عورتوں نے انجام دی۔ ۸ار مارچ کو قومی دن کی حیثیت حاصل ہوگئی اور ہر سال یہ رسم دہرا کر منائی جانے لگی۔"

(روز نامہ نوائے وقت ملتان ۱۸ر اپریل ۱۹۹۶)

غالباً ایسے ہی ایک جلسے کا حال اعظم ہاشمی مرحوم نے اپنے سفر نامہ ہجرت میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"(ایک دن) کمیونسٹ پارٹی نے نمازِ مغرب کے بعد (بخارا کی) تمام بڑی بڑی مساجد میں جلسے منعقد کیے۔ اہلِ محلّہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی پردہ نشین بہو، بیٹیوں اور بیویوں کو لے کر مسجد میں آئیں۔ مسلح پولیس کے سپاہی ایک سرخ فوجی کی سرکردگی میں گھر گھر گئے اور مردوں اور عورتوں کو جانور کی طرح ہانک لائے۔ مسجد کے دروازے پر دو کمیونسٹ کھڑے تھے جو مستورات کے سروں سے برقعے، چادریں اور دوپٹے اُتار اُتار کر مسجد کے صحن میں ڈھیر کر رہے تھے۔ رات کے دس بجے سب لوگوں کے سامنے سارے ڈھیر کو آگ لگا دی گئی اس کے بعد تقریریں شروع ہوگئیں۔ کمیونسٹ مقررین یکے بعد دیگرے پردے کے خلاف آتشیں تقریریں کرتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے رہے۔ ایک باشقرستانی یہودی کمیونسٹ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

پردہ مردوں کے ظلم کی نشانی ہے۔ اب عورتیں آزاد ہوگئیں ہیں وہ دفتر میں نوکری کر سکیں گی۔ فرغانہ کے غیور باشندے اس حقیقت کو پا چکے ہیں۔ ان کی عورتیں آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہو چکی ہیں۔ نکاح اور طلاق کا جھنجھٹ اب باقی نہیں رہا۔ وہ مردوں کے ظلم سے آزاد بڑے آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

("اُف یہ پادری" صفحہ ۳۳۷ بحوالہ سمر قند و بخارا کی خونی سرگزشت)

ایران میں حجاب کی مخالفت:

ایران میں رضا شاہ پہلوی کے دور میں برقعہ پہننے پر پابندی عائد تھی۔

"ایران میں رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۳۵ء میں برقع ممنوع قرار دے دیا۔"

(ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد ۳ ص ۲۲۶)

یہ عین وہی زمانہ تھا جب برصغیر پاک و ہند میں اکبر آلہ آبادی اور علامہ اقبال اس روشن خیالی صلیب کے سامنے سینہ سپر تھے۔

اکبرالہ آبادی لکھتے ہیں:

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

اور علامہ اقبال کہتے ہیں:

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک — ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید — مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

ترکی میں حجاب کی مخالفت:

یہودیوں کے کٹھ پتلی کمال پاشا نے ترکی کو جدید ترکی میں تبدیل کرنے، تہذیب کو ثقافت کو جس طرح کچلا وہ تاریخ کے صفحات پر واضح ہے۔ اس نے ترکی ٹوپی اور سر کے ہر لباس حجاب' اسکارف کو خلاف قانون قرار دیا اور ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیا۔

آیئے دورِ حاضر میں اس ترکی کی روشن خیالی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جاوید چوہدری اپنے کالم زیرو پوائنٹ میں لکھتے ہیں:

''میڈم مروے کا تعلق فضیلت پارٹی سے تھا۔ وہ ۱۸؍ اپریل ۱۹۹۹ء کے الیکشن میں ترک پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوئی۔ مئی میں حلف برداری کا موقع آیا تو مروے سر پر اسکارف لے کر پارلیمنٹ چلی گئیں۔ یہ جدید ترکی کی ۷۶ سالہ تاریخ کا حیران کن واقع تھا۔ کیونکہ جب ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی آزاد ہوا تو کمال اتا ترک نے عربی رسم الخط، دینی تعلیم اور اذان کے ساتھ سر ڈھانپنے اور حجاب لینے پر پابندی لگا دی تھی۔ کمال اتا ترک کا کہنا تھا اگر ہم ترکی کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسے سیکولر ثابت کرنا ہوگا۔ اس وقت سے ترکی میں عورت کا ننگا سر اور سیکولرازم ایک ہو چکے ہیں۔ لیکن مئی ۱۹۹۹ء میں مروے نے اسکارف کے ساتھ پارلیمنٹ میں داخل ہو کر سیکولرازم کے ترک فلسفے کو چیلنج کر دیا۔ مروے کی اس حرکت میں پارلیمنٹ میں زلزلہ آ گیا۔ سیکولر ارکان نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ترکی میں سیکولر ازم کی ضامن فوج نے بھی مروے کی جسارت کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ لہٰذا صدر سلیمان ڈیمرل نے مروے کی رکنیت اور شہریت دونوں منسوخ کر دیں۔ یہ ایک سیکولر سٹیٹ کا ایک ایسے آزاد شہری سے انتقام تھا جو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ۲۹؍ اکتوبر

۲۰۰۳ء کو یہ صورت حال ایک بار پھر شدت کے ساتھ سامنے آئی۔ اس دن ترک قوم نے اپنا ۸۰ واں یوم آزادی منایا۔ قومی دن کی روایات کے مطابق صدر، ارکان پارلیمنٹ اور حکومتی عہدیداروں کے اعزاز میں ایک دعوت کرتا ہے جس میں ارکان کی بیگمات بھی شریک ہوتی ہیں لیکن اس بار کیونکہ ترکی میں طیب اردگان کی سربراہی میں ایک اسلامی جماعت جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی حکومت ہے اور اس پارٹی کے زیادہ تر عہدیداروں کی بیگمات سروں پر اسکارف باندھتی ہیں لہٰذا صدر کے لیے ان تمام حضرات کو دعوت دینا مسئلہ بن گیا۔ صدر نے طویل غور و خوض کے بعد اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ انہوں نے حکومت، پارلیمنٹ کے ارکان اور حکمران پارٹی کے چیدہ چیدہ ممبروں سے درخواست کی کہ آپ تقریب میں بیگمات کو نہ لائیں۔ صدر کے اس فارمولے کی زد میں وزیراعظم طیب اردگان بھی آگئے کیونکہ ترکی کی خاتونِ اوّل بھی سر پر اسکارف لیتی ہیں۔ اس اقدام پر جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی نے صدارتی تقریب کا بائیکاٹ کیا اور صدر احمد نجات سیزا نے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا۔"

(روزنامہ جنگ لاہور ۸ر نومبر ۲۰۰۳)

انہی میڈم مروے کواکچی کا ایک انٹرویو ماہنامہ امپکیٹ انٹرنیشنل ۲۰۰۱ء مارچ میں شائع ہوا۔ اس کے چند اہم اقتباس ہم یہاں پیش کر دیتے ہیں۔

سوال: جب آپ ترکی کی پارلیمنٹ میں حجاب کے ساتھ پہلی دفعہ داخل ہوئیں تو آپ کیا سوچ رہی تھیں؟

جواب: ترک جمہوریت کی ۷۶ سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ دو عورتیں جو حجاب لیتی تھیں ترک پارلیمنٹ میں منتخب ہوگئیں۔ نسرین اونال ایسی دوسری ممبر پارلیمنٹ تھیں انہیں اسکارف اتارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سب سے پہلی ہونے کی وجہ سے بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ گو کہ میں ان ۷۰ فیصد ترک خواتین کی نمائندگی کر رہی تھی جو اسکارف پہنتی ہیں لیکن ملک میں ایک اقلیتی اشرافیہ ایک طویل عرصے سے حکومت کر رہا ہے۔ جو لوگ اس طبقے سے متعلق ہیں وہ کھلے ذہن کے مہذب جمہوری نہیں کہ ان لوگوں کا احترام کر سکیں جو ان کی طرح کپڑے نہیں پہنتے اور ان کی طرح سوچتے نہیں۔ مجھے ان کی طرف سے مخالفت کی توقع تھی لیکن مجھے اس کا تصور نہیں تھا کہ یہ اتنی تہذیب دشمن اور ظالمانہ ہوگی۔

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

میں اب اپنی نمائندگی نہیں کرتی۔ میں ترکی کی مظلوم قدامت پسند خواتین کی آواز ہوں جو ۲۵ سال سے موجود ہیں اور ان سے اس لیے امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے کہ وہ حجاب پہننا چاہتی ہیں انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے کیریئر اور مذہب میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ اُن کی کوئی آواز نہیں ہے۔ میں ان

کی آواز کو ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے جہاں تک لے جاسکوں لے جانا چاہتی ہوں۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن اپریل ۲۰۰۱ء مضمون: اسکارف بمقابلہ بندوق، اردو ترجمہ مسلم سجاد)

عزیزان گرامی! حجاب ان روشن خیالوں کے لیے کیا مسائل پیدا کر رہا ہے جو یہ اس کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کردینے کے در پے ہیں؟

یہ اسلامی تہذیب وثقافت کی اس درجہ کیوں مخالفت کر رہے ہیں ہم آگے اس کو تفصیلاً بتائیں گے۔

فرانس میں اسکارف کی مخالفت:

فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسقوا اور وزیر تعلیم فرینکوائس بائرو (francois bayrow) نے تمام پبلک اسکولوں میں زیر تعلیم مسلمان طالبات پر حجاب پہننے پر پابندی لگادی۔ اور پھر فرانس میں اسکارف اوڑھ کر تعلیم حاصل کرنے پر ان کو اسکول سے خارج کر دیا گیا' ان پر تعلیم کے دروازے بند کر دیے گئے۔ فرانسی وزیر داخلہ نے اپنی پارلیمنٹ کو بتایا کہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اسلامی عقاید کو ہمارے معاشرتی رسم ورواج کا حصہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

عزیزانِ گرامی! آپ نے ملاحظہ کیا کہ اسلامی تہذیب وثقافت کو کچلنے کے لیے پوری دنیاے یہود و نصاریٰ اور ان کے مہروں نے اپنی پوری طاقت استعمال کی...... لیکن اس تہذیبی وثقافتی دہشت گردی پر کسی روشن خیال اور ترقی پسند نے اپنے قلم یا زبان سے مذمت نہیں کی۔

آخر کیوں؟ کیا مسلمانوں کو اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں؟

دوستو! یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ حجاب، اسکارف فرانس کے سیکولر نظام سے متصادم نہیں۔ اور اگر ہے تو وہاں عیسائی بچے صلیب اور یہودی طالب علم اپنے سروں پر مخصوص ٹوپی کیوں پہنتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت کی درج ذیل رپورٹ ملاحظہ فرمایئے:

"یادرہے کہ فرانس کے اسکولوں میں بچیوں کو صلیب لٹکانے اور سر پر مخصوص ٹوپی پہننے کی اجازت ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی مخصوص مذہبی علامات ہیں۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۵ نومبر ۱۹۹۴)

ملتِ اسلامیہ کی باوقار بیٹیو! پردہ ان کو کیوں کھٹکتا ہے؟ اس لیے کہ حجاب ان کے دیگر مقاصد کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ فحاشی، لہو ولعب، موسیقی، فلم اور خاندانی انتشار کے راستے میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔

لازمی سی بات ہے جب عورت بے پردہ ہوگی تو اس کے چہرے پر غلیظ نظریں بھی پڑیں گی۔ اور جب میڈیا کے ذریعے فحاشی وعریانیت کا سیلاب اور حکومتوں کے ذریعے زنا کاری کے پرمٹ جاری ہوں گے اور آزادانہ اختلاط جن فتنوں کو جنم دے گا وہ آپ پر پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے جو خوفناک نتائج بن بیاہی

کنواری ماؤں کی صورت میں نکلیں گے اس کے لیے مغرب کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے۔

عزیزان گرامی! اس دہشت گردی میں مغرب کے اہلِ قلم ہی نہیں بلکہ اس غیر ملکی ثقافت کو عام کرنے کے لیے اور ان کو پھیلانے کے لیے ملک کے بڑے بڑے ادبا، اہلِ قلم اور مصنفین رضا کارانہ طور پر اپنی خدمت پیش کررہے تھے۔ اور اس مہم کو تیز کرنے میں قلمی مزدوروں کی بھی کمی نہ تھی۔

ان کے لیے تو میں اتنا ہی کہوں گا

کہاں مقام سخن اور کہاں سیاستِ شب
کہاں یہ اشک کہاں تاجرانِ جشن طرب
کہاں رجز کی بلندی کہاں سلے ہوئے لب
کہاں زمان و مکاں اور کہاں عراق و عرب
حدودِ شام و سحر سے نکل گئے کچھ لوگ
ذرا سی دھوپ میں آکر پگھل گئے کچھ لوگ

اور ان ہی قلمی مزدوروں نے یہ تاثر دیا کہ کلچر کا تعلق مذہب سے نہیں۔ ایک ادیب یوں رقم طراز ہے:

''مسلم کلچر نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہر مسلمان کا کلچر دوسرے سے مختلف ہے۔ تمام مسلمان ممالک میں دینی اعتقادات بے شک ایک ہیں لیکن ان کا کلچر ایک نہیں ہوسکتا۔''

(احمد ندیم قاسمی، روزنامہ جنگ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۱ء)

یہ تہذیب وثقافت کو زمین سے وابستہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی اخوت کا شفاف آئینہ چکنا چور ہوگیا۔ اس افسوس ناک حقیقت کا ادنیٰ سا منظر ہر سال پاکستان میں دیکھا جاتا ہے کہ یومِ آزادی کے دن پاکستان کے مسلمان سندھی، ہندو سندھیوں سے یکجہتی کے لیے کنٹرول لائن کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ان حد بندیوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں لیکن دوسرے صوبوں کے پنجابی، پٹھان، مہاجر کا وجود انہیں برداشت نہیں۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔

اسی طرح ایک اور قلمی مزدور اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''عصر حاضر میں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں جلباب یا دوپٹے کے بغیر راہ چلتی عورت کو کوئی تنگ نہیں کرتا تو کیا وہاں بھی چادر اور دوپٹہ اوڑھنا ضروری ہو جائے گا۔ مَیں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اکثر غیر ملکی مہذب معاشروں میں مسلمان عورتیں کسی محرم کے بغیر بلا خوف وخطر طویل سفر اختیار کرسکتی ہیں اور کوئی نامحرم ہمسفر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔''

(روزنامہ جنگ ۴ تا ۷ جولائی ۱۹۸۵ء میں عورت، پردہ اور جدید زندگی کے مسائل پر پروفیسر وارث میر کے مضامین)

وارث میر صاحب کے مضمون پر مَیں کیا تبصرہ کروں، روزنامہ جنگ کی یہ رپورٹ ملاحظہ کیجیے:

''اس وقت مہذب دنیا میں ہر ۴۵ سیکنڈ کے بعد ایک عورت کو بے آبرو کر دیا جاتا ہے۔''

(روزنامہ جنگ ۱۲ نومبر ۱۹۹۵ء)

اس بات کا اعتراف تو پردے کی مخالف بے نظیر بھٹو نے بھی کیا ہے، لکھتی ہیں:

''ہماری ابتدائی کلاس میں ہمیں زنا بالجبر کے خطرات کے متعلق جو لیکچر دیے جاتے تھے، ریڈ کلف میں سن کر وحشت ہوتی تھی۔ میں نے امریکہ آنے سے قبل زنا بالجبر کے بارے میں کبھی سُنا تک نہیں تھا اور اب اس امکان کی وجہ سے مَیں اگلے چار سال کبھی رات کو اکیلی گھر سے باہر نہیں نکلی۔''

(دخترِ مشرق از بے نظیر بھٹو ص ۸۶)

محترمہ کے اس بیان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ پاکستان میں جس جرم کے متعلق بے نظیر نے سُنا تک نہیں تھا امریکہ کے بے لگام معاشرے میں ایک ہولناک حقیقت تھا۔

عزیزانِ گرامی! یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو اس لیے مٹانا چاہتے ہیں کہ کہیں ان کے حرص و ہوس کے بے قابو نفس جن کے لیے عورت ایک دل لبھانے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ انہیں سیکولر نظام کی پرواہ نہیں بلکہ اپنی بدمست جوانی کی سفلی خواہشات کی پرواہ ہے۔ کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے اندر کتنا بڑا ظرف رکھتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! اسلامی تہذیب کو دیکھنا ہو تو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا منظر نگاہوں کے سامنے لے آیئے۔ ہم یہاں صرف چند ایک اقتباس پیش کرتے ہیں کہ کس طرح یورپ کی خواتین کے لیے اسلامی ثقافت، حجاب کی اہمیت تھی۔

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

''سسلی کے پایہ تخت میں تین ہزار سے زیادہ جامہ باف تھے۔ ان کی تیار کردہ عباؤں، قباؤں اور چادروں پہ قرآنی آیات بھی ہوتی تھیں جنہیں عیسائی بادشاہ اور پادری فخر سے پہنتے تھے۔ سسلی میں عیسائی عورتیں نقاب اوڑھتی تھیں۔''

(''یورپ پر اسلام کے احسانات'' از غلام جیلانی برق صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ شیخ غلام علی سنز)

مزید آگے لکھتے ہیں۔

''اسلامی تہذیب نے حیات مغرب کے ہر پہلو پر اثر ڈالا۔ ان لوگوں کے لباس بدل گئے، طور طریقے تبدیل ہو گئے، تعمیرات میں مشرقیت آگئی، عورتوں کا احترام بڑھ گیا اور انہوں نے حریص نگاہوں سے بچنے کے لیے نقاب اوڑھ لیے۔''

(یورپ پر اسلام کے احسانات، صفحہ ۱۵۰ بحوالہ رحلۃ ابن جبیر)

''جو عیسائی لڑکیاں شاہی محل میں داخل ہوتی ہیں۔ وہ مسلم کنیزوں کی نیکی، پاکیزگی اور نماز سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتی ہیں۔''

(ایضاً صفحہ ۱۵۲)

آیئے اس زندہ حقیقت کو دور حاضر میں ملاحظہ فرمایئے:

حجاب اور نومسلم خواتین:

نومسلم ہندو خاتون کملا داس جن کا اسلامی نام ثریا ہے ایک انٹرویو میں اس سوال پر کہ آپ کو اسلام میں سب سے زیادہ پُرکشش بات کیا لگی؟ کہا:

''مجھے مسلمان عورتوں کا برقعہ بہت پسند ہے، مَیں پچھلے ۲۴ برسوں سے پردے کو ترجیح دے رہی ہوں، جب کوئی عورت پردے میں ہوتی ہے تو اس کو احترام ملتا ہے، کوئی اس کو چھونے اور چھیڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا اس سے عورت کو مکمل تحفظ ملتا ہے۔''

(ہفت روزہ ''نئی دنیا'' نئی دہلی ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

ثریا نے اب برقعہ کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ پردے کے بغیر زندگی کو آزادی نہیں سمجھتی بلکہ ایسی آزادی کو عورت کے لیے زہر قاتل سمجھتی ہے۔ اس نے اس سوال پر کہ کیا برقعہ آپ کی آزادی کو متاثر نہیں کرتا؟ کہا:

''مجھے آزادی نہیں چاہیے، اب تو آزادی میرے لیے ایک بوجھ بن گئی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کو باضابطہ اور باقاعدہ بنانے کے لیے گائیڈ لائن کی ضرورت تھی، ایک خدا کی تلاش تھی جو تحفظ دے۔ پردے سے عورت کو مکمل تحفظ ملتا ہے، پردہ تو عورت کے لیے بلٹ پروف جیکٹ ہے''۔

(ہم کیوں کفر سے اسلام میں داخل ہوئیں۔ ص ۱۱۶)

نومسلم عیسائی خولہ لگا تا کہتی ہیں:

''پہلے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مسلم بہنیں برقعے کے اندر کیسے آسانی سے سانس لے سکتی ہیں۔ اس کا انحصار عادت پر ہے، جب کوئی عورت اس کی عادی ہو جاتی ہے تو

کوئی دقت نہیں ہوتی، پہلی بار میں نے نقاب لگایا تو مجھے بڑا عمدہ لگا۔ انتہائی حیرت انگیز، ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک اہم شخصیت ہوں، مجھے ایک ایسے شاہکار کی مالکہ ہونے کا احساس ہوا جو اپنی پوشیدہ مسرتوں سے لطف اندوز ہو، میرے پاس ایک خزانہ تھا جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا، جسے اجنبیوں کو دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔"

(ہم کیوں کفر سے اسلام میں داخل ہوئیں۔ ص ۲۰۴)

نومسلم دوشیزہ صوفی رولڈ کی سرگزشت:

"میں نے سر ڈھانکنا شروع کیا تو میرے باپ کا تبصرہ یہ تھا کہ "بڑھی کھوسٹ لگنے لگی ہو"۔ یہ تبصرہ آج کل عام ہے۔ لوگ سر پر اسکارف باندھنا ترک کر چکے ہیں، اس لیے شاید وہ مجھے عجوبہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال میں تو اپنے آپ کو عجوبہ نہیں سمجھتی ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور اس طرح میں ناروے میں غیر ملکی سی ہوگئی ہوں۔ میرے مسلم احباب زیادہ تر عرب یا پاکستانی ہیں۔ اس ماحول میں مجھے گرم جوشی، تدبر اور دانائی ملتی ہے، ایسی دانش جو ناروے کے انفرادیت پرست ماحول سے کوسوں دور ہے۔"

(ہم کیوں کفر سے اسلام میں داخل ہوئیں۔ ص ۲۲۶)

عزیزانِ گرامی! انہیں اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں اسلام عالمی مذہب نہ بن جائے اور وہ خواب جو یہودی، دنیا پر حکومت کرنے کا دیکھ رہے ہیں چکنا چور نہ ہو جائے۔ اس لیے اسلامی تہذیب وثقافت کو کچلنے کی یہ مہم جاری و ساری ہے

بنات اسلام! ...... کیا پردہ ایک ظلم ہے؟ ...... کیا حجاب ایک جبر ہے؟

کیا برقعہ ایک قید خانہ ہے؟

اگر یہ ظلم ہے تو ہر عورت کے ساتھ ظلم ہے ...... اگر یہ جبر ہے تو ہر عورت کے ساتھ جبر ہے ...... اگر یہ قید خانہ ہے تو ہر عورت کے لیے قید خانہ ہے۔

خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی، یہودی ہو یا مشرک۔

لیکن! ذرا سوچیے! ظلم وستم، جبر وقید خانے کا پروپیگنڈہ صرف مسلم عورتوں کے ساتھ ہی کیوں؟ مسلم خواتین اس پروپیگنڈے کا شکار کیوں؟

کیا عیسائیت میں ننیں اپنے سروں کو اسکارف سے ڈھانپ کر نہیں رکھتیں۔

اگر یہ جبر ہے تو یہ ایک عیسائی نن پر بھی جبر ہے؟

لیکن یہ نن خواہ برطانیہ کی ہو یا فرانس کی، اٹلی کی ہو یا جرمنی کی جب سر پر اسکارف لیتی ہے تو

پورا یورپ اسے جھک کر سسٹر یا مدر کہتا ہے لیکن یہی اسکارف ترکی، انڈونیشیا، ملائیشیا، سودی عرب اور پاکستان کی عورت سر پر رکھ لیتی ہے تو اسے نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے جاہل، گنوار، غیر ترقی یافتہ اور فنڈامینٹالسٹ (Fundamantalist) کہا جاتا ہے۔

بناتِ اسلام! ...... کیا اسکارف ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ ...... کیا پردہ روشن خیالی کے لیے خطرہ ہے؟ ...... کیا حجاب وسعت فکر کے لیے زنجیر ہے؟

عزیزانِ گرامی! اس وقت پورے یورپ میں چھوٹے بڑے ۷؍لاکھ چرچ اور مذہبی اسکول ہیں۔ امریکہ کے اندر ایک لاکھ ۲۲ ہزار چرچ ہیں۔ ان ۸ لاکھ ۲۲ ہزار چرچوں میں ۲۶ لاکھ ننیں (سسٹرز اینڈ مدرز) ہیں اور یہ تمام ننیں اپنے سروں پر اسکارف لیتی ہیں اور برقعہ نما ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنتی ہیں اگر ان کے گاؤن اور اسکارفوں کے باوجود وہاں ترقی ہوئی تو مسلم دنیا ترقی کیوں نہیں کرسکتی؟

بناتِ اسلام! یہ حجاب کے خلاف تہذیبی و ثقافتی دہشت گردی اس لیے ہے کہ
تم سے تمہاری قوم کا مستقبل وابستہ ہے!

تمہاری گود سے صلاح الدین ایوبی اور محمد بن قاسم کی صورت میں فلاحِ اُمت کی صبحیں پھوٹ سکتی ہیں ...... تمہاری غیرت ارتقا و بقا کی تاریخ رقم کرسکتی ہے۔ ...... تمہاری حیا، زندگی کے چمن میں بہار کے شگوفے کھلا سکتی ہے ...... تمہارے رت جگے ملت کا مقدر جگا سکتے ہیں۔

دخترانِ ملت! اس جنگ میں تمہارا کردار بھی بہت اہم ہے۔ تمہیں اپنی پاک تہذیب و ثقافت میں نقب لگانے والوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ خود بھی اسلامی تہذیب پر عمل پیرا رہنا اور دیگر مسلمان دوشیزاؤں کو بھی اسلامی ثقافت سے ہم آہنگ کرنا ہے ...... تمہارے سر سے چادریں اور تمہارے چہروں سے نقاب کھینچنے کے لیے اگر مغرب کے ہاتھ بڑھتے تو ہم ضرور کاٹ ڈالتے۔ تمہارے برقعوں کو جلانے کے لیے اگر کوئی آگ سلگاتا تو ہم اسے اسی آگ میں جلا ڈالتے۔

ہمیں کمینے دشمن سے واسطہ ہے جس نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے ...... نام نہاد ادیبوں کے ذریعے ...... عقل سے پیدل دانشوروں کے سہارے ...... اور روشن خیال حکمرانوں کے بل بوتے پر تمہاری تہذیب و ثقافت پر شب خون مارنے کی تیاری کی ...... یہ شب خون، یہ حملہ تمہارے سروں سے چادریں اپنے ہاتھوں سے نہیں کھینچے گا بلکہ تمہارے ذہنوں کو اس روشن خیالی کے لیے میڈیا کے ذریعے اور زرد صحافت کے ذریعے ...... عاصمہ جہانگیر، حنا جیلانی، شبانہ اعظمی جیسی عورتوں کے ذریعے تمہارے ذہنوں کو پراگندہ کرکے نوچے جائیں گے۔ بس فرق اتنا ہوگا پہلے تمہیں بے آبرو کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے اور آج تم بے آبرو ہونے کے لیے خود تیار ہوگی۔ (بقیہ ...... صفحہ ۵۲ پر)

آستانۂ خواجہ غریب نواز مرجع خلائق

از: مفتی ولی محمد رضوی، سنی تبلیغی جماعت، باسنی، ناگور، راجستھان

بحمد للہ تعالیٰ و بکرم حبیبہ الاعلیٰ جل جلالہ وصلی اللہ علیہ وسلم ہندو پاک کی سرزمین پر فیضانِ رب و عنایات رسول کریم علیہ السلام کے چشمے ابتداے اسلام سے ہی جاری اور اُبلتے رہے اور یہ بے آب وگیاہ زمین ایمان واسلام کی بنیاد سے شاداب ہوتی رہی۔ تاریخ کے ابواب سے یہ حقیقت روزِ روشن سے زیادہ ظاہر ہے۔ اولیاے کاملین نے اور علماے ربانیین نے اپنے قدومِ ناز سے اسے رشکِ ثریا بنادیا۔ جدھر جایئے ان کے آستانے، بلند گنبد اور عظیم مزارات و خانقاہیں اور ان کے قرب وجوار میں بڑی بڑی مساجد و مدارس کی عمارتیں اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ یہ تاریخی مقامات علامات و آثار ہیں جو زبانِ حال سے بتارہے ہیں کہ یہ ملک اولیا، علما کا مسکن رہا ہے اور آج جو اسلامی رنگ و رونق اس وسیع وعریض ملک میں نظر آرہی ہے یہ عرفاے حق کی بے مثال اور بے لوث قربانیوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے۔

سب اولیاے حق لائق ادب وعقیدت ہیں خواہ وہ سلسلۂ عالیہ قادریہ کے مشائخ ہوں یا سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ، خواہ وہ سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے بزرگ ہوں یا سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ ہوں یہ سب مدنی پیارے مصطفیٰ ﷺ کے نائب و وارث ہیں (رضی اللہ عنہم اجمعین) نام تو ایک شناخت ہے ورنہ سب توحید کی مے مست الست وجامِ محمدی کے مے خوار ہیں۔ تھوڑا سا ظاہری رنگ و روپ مختلف ہے ورنہ حقیقت میں سب ایک ہیں۔ سب دین کے علم بردار اور اسلام کے ترجمان ہیں۔ ان کی عقیدت و الفت کے بغیر اسلام کا تصور پھیکا اور بے روح ہے۔ ان کو سمجھے بغیر اسلام کو سمجھنا خام خیالی ہے۔ ہزاروں تاریخ و سیرت نگاری کی تالیفات وتصنیفات میں ان کے کارنامے روحانیت کی دنیا میں تاروں سے زیادہ منور و تاباں ہیں۔

آنکھ والے تیری جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ان اولیا کے جھرمٹ میں اور ان مقدس ہستیوں کے گروہ میں ایک ہستی جو سردار اولیاے ہند بن کر چمکی، جو خواجۂ خواجگان معین الدین حسن چشتی اجمیری قدس سرہ کے نامِ گرامی سے یاد کی جاتی ہے۔ جو پیدا تو سنجر میں ہوا اور مرشدِ برحق حضرت شیخ الشیوخ خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی تعلیم وتربیت

حاصل کی اور اتنی کی کہ ۲۰ سال مسلسل آپ کی صحبت سے مالا مال ہوتے رہے کہ نظر عثمانی نے معین کو تاج دارِ ہند بنا دیا اور مرشدِ برحق کی بارگاہ اور توسّل سے بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ کی حاضری نے وہ مقبولیت عطا فرمائی کہ بوقت وصال قلمِ قدرت نے پیشانی پر لکھا ھذا حبیب اللہ مات می حب اللہ محبوبِ خدا' خدا کی محبت میں موت کا جام پی چکا ہے۔ (خواجہ غریب نواز ۱۱۸) فقیر کے تبرک نے وہ انقلاب پیدا کیا کہ باغ وغیرہ فقرا پر تقسیم کر کے راہِ حق میں نکل پڑے اور پھر ہمیشہ کے لیے اسی راہ کے راہی بن گئے اور راہ گیروں کے آپ رہنما بن گئے۔ مسلسل فقر و فاقہ، مجاہدہ و ریاضت سے کندن بن گئے اور دل و نظر اس قدر منور ہوئے کہ جس پر نظر پڑ گئی اس کی تقدیر چمک گئی، قسمت مہک اٹھی۔

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

بارگاہِ رسالت سے اشارہ پا کر بلکہ حکم حاصل ہوا تو ہند کا سفر کیا اور اجمیر میں قیام کر کے دین کی خدمت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ عطائے رسول ہیں۔ روحانی پشت پناہی سے وہ انقلاب برپا کیا کہ ہر جگہ فیضانِ نبوت رہنمائی کرتا رہا اور کفرستان میں اسلام کی بہار ہی بہار نظر آنے لگی۔ ایسے مقام پر جہاں سب اجنبی ہوں، ظلم وستم کا مرکز ہو، جہاں اسلام کا نام لینا جرمِ عظیم ہو، وہاں عزم و استقلال کے ساتھ حق کا پرچم لہرانا آپ کا کمال تھا۔ پھر یہاں سے اکثر مقامات پر نورِ اسلام پھیلتا گیا اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ تاقیامت چلتا رہے گا۔ آج اس در پر آ کر نہ جانے کتنے لوگ اسلام قبول کرتے ہیں۔ یہ روحانی فیض جاری رہے گا اور غریب نواز کی حکومت چلتی رہے گی۔

یہاں دعا تو ایسی مقبول ہوتی ہے کہ امیر و غریب، بادشاہ و وزیر جھولی پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اور ان کے توسّل سے خالی دامن مرادوں سے بھر کر لے جاتے ہیں۔ آپ کا در محتاجوں کا ٹھکانہ ہے۔ امام احمد رضا فرماتے ہیں:

''خواجۂ ہند کے مزار شریف پر دعا قبول ہوتی ہے۔'' (حسن الوعاء فی آداب الدعا، ص ۵۰)

یہ ہے مجدد اعظم کی غریب نواز سے دلی عقیدت کا اظہار جو چھپا نہیں بلکہ عیاں ہے اور غلامی خواجہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی ملاحظہ کریں کہ مجددِ اعظم سے جب اجمیر کے ساتھ شریف نہ لگانے کی بابت سوال کیا گیا، تو آپ نے محبت بھرا جواب دیا۔

''اجمیر کے نام پاک کے ساتھ لفظ شریف نہ لکھنا اور ان تمام مواقع میں اس کا التزام نہ کرنا اگر اس بنا پر ہے کہ حضور سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللہ عنہ کی جلوہ افروزی حیات ظاہری و مزار منور کو (جن کے سبب مسلمان اجمیر شریف کہتے ہیں) وجۂ شرافت نہیں جانتا تو گمراہ بلکہ عدو اللہ ہے۔ صحیح بخاری شریف میں

ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: من عادی ولیا فقد اذنتہ بالحرب جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی تو اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔ اور اگر یہ ناپاک التزام بربنائے سستی اور کوتاہ قلبی ہے تو سخت بے برکتی اور فضلِ عظیم وخیرِ جسیم سے محروم۔" (فتاویٰ رضویہ، جلد ۶، صفحہ ۱۸۷ رضا اکیڈمی ممبئی)

آج آستانہ خواجہ آٹھوں پہر آباد ہے۔ ہزاروں عقیدت مند پروانہ وار شمع کے گرد منڈلاتے ہیں۔ یہ رب العالمین کے دربار میں حضور خواجۂ ہند علیہ الرحمہ کی بے مثال مقبولیت ہے جو فرقۂ وہابیہ نجدیہ کو ایک نظر نہیں بھاتی ہے۔ اور باطل فرقہ کے باطل سرغنہ مودودی نے اپنی باطل و فاسد کتاب "تجدید واحیائے دین" میں صاف لکھا ہے کہ جو لوگ کلیر و اجمیر جاتے ہیں تاکہ ان کی مرادیں پوری ہوں اور مشکلات حل ہوں وہ زنا وقتل سے بھی بُرا گناہ کرتے ہیں۔ اللّٰہ اللّٰہ معاذ اللہ استغفر اللہ ربی من کل ذنب. (ص:۹۶)

یہ ہے شرارت آمیز فساد انگیز قلم کی شرارت وفساد کہ چند جملوں ہی میں بتادیا کہ ولی دشمنی میں ان کا قلم آگ اگل رہا ہے۔ ایسے دریدہ دہنوں کو للکار کر امامِ عشق ومحبت کہتے ہیں:

حاکم حکیم داد و دوا دیں یہ کچھ نہ دیں
مردود یہ مراد کس آیت خبر کی ہے

یعنی اے وہابی! حاکم سے انصاف اور حکیم سے دوا لینے علاج کرانے والے تم اُن سے داد و دوا لے رہے ہو تو کیا اُن کو خدا سمجھ کر لے رہے ہو اور اگر غیر خدا سمجھ کر جاتے ہو، ضرورت پوری کرانے جاتے ہو تو تم وہاں جاکر پکے مومن وموحد ہی رہ گئے۔ تو اے ظالم سُن! ہم اللہ والوں کے آستانوں پر انہیں محبوبِ خدا سمجھ کر جاتے ہیں، خدا کا پیارا جان کر اور مان کر جاتے ہیں۔ جب تو ان دنیاداروں کے یہاں سوال کر کے بھیک مانگ کر مسلمان ہی رہ گیا تو ہم محبوبانِ خدا سے وسیلہ طلب کر کے مشرک کیسے ہو گئے؟

اللہ رے خود ساختہ توحید کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

شامی شریف کے مقدمہ میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں انی لا تبرک بابی حنفیۃ واجیئ الی قبرہ یعنی میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے برکت حاصل کرتا ہوں اور ان کی قبر پر آتا ہوں۔ جب مجھے کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے تو دو رکعت کھڑے ہوکر اور امام ابو حنیفہ کی قبر کے پاس کھڑے ہوکر رب سے دعا کرتا ہوں تو فوراً حاجت پوری ہوجاتی ہے۔ مودودی کے قول بدتر از بول سے تو امام شافعی بھی معاذ اللہ قاتل وزانی سے بدتر ہوئے مگر حقیقت میں وہ امامِ اہلِ حق تھے اور ہیں۔ مودودی اور وہابیت باطل وفساد کا نام ہے۔ جن کا مشن ہی انبیا، اولیا کی شان وقدر کو دلوں سے کھرچ کر نکالنا اور

عقیدت و الفت کے چراغ کو گل کرکے شیطان کی آماج گاہ بناتا ہے۔ نماز روزہ کی تبلیغ تو صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔

لہٰذا عوام اہلسنّت کو ان بگلا بھگتوں سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔ خضر کے بھیس میں آنے والے رہزنوں سے ہوشیار رہنا ہے۔ غرضیکہ حضور غریب نواز علیہ الرحمہ وہ مقبولِ خدا ہیں کہ آج ہزاروں بچوں کے نام ان کی یاد و محبت میں رکھے گئے ہیں۔ آج سیکڑوں مدارس و مساجد ان کے نام گرامی سے منسوب ہیں۔ آج متعدد کوچہ و بازار ان کے نام سے رکھے گئے ہیں۔ سیکڑوں شعرا نے ہزاروں اشعار ان کی شان میں لکھے ہیں اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ہزاروں مضامین و مقالات قلم کاروں نے لکھ کر عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا ہے۔ سیر الاولیا میں ان کا تذکرۂ جمیل کرکے تاریخ اسلام میں آپ کے کارناموں کو اجاگر کردیا ہے۔ ہر ماہ چھٹی شریف پر بھی آپ کے کارناموں کو بیان کیا جاتا ہے۔ عرس میں عقیدت مند آتے ہیں اور آپ کے وسیلہ سے بارگاہِ خداوندی میں دعائیں کرتے ہیں پھر مرادیں پوری کرواکے جاتے ہیں۔ عرس ۶/رجب المرجب کے موقع پر تو بارگاہِ خواجہ ہند میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ جان کی بازی لگا کر بھی حاضری دینا غلام سعادت سمجھتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ اس دربار کو شان سے تادیر قائم رکھے، خواجۂ خواجگاں کے مراتب کو مزید بلند فرمائے اور ان کے فیضان سے ہم سب کو مالا مال فرمائے۔ تمام اہلسنّت و جماعت کے ایمان و آبرو، جان و مال کی حفاظت فرمائے اور گستاخانِ اولیا سے ہمیں دور و نفور رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وسلم

خواجۂ ہند وہ دربار ہے اعلیٰ تیرا
کبھی محروم نہیں مانگنے والا تیرا

احمد رضا خاں قادری

عہد کا خالد ہے تو اس دور کا طارق ہے تو — سیف ہے خامہ ترا احمد رضا خاں قادری
مظہر نعمان تو غوث جلی کی شان تو — ممتاز ہے تیری ادا احمد رضا خاں قادری
ہند سے بغداد تک، بغداد سے حرمین تک — تیری وفا کا تذکرہ احمد رضا خاں قادری
نوری و بوالفیض کا یہ بدر پر احسان ہے — جن سے تیرا در ملا احمد رضا خاں قادری

علامہ بدر القادری

حافظِ ملت: دینی اخلاص پروری اور ملی دردمندی کا روشن استعارہ

از محمد صادق رضا مصباحی، شعبہ تصنیف وتالیف المجمع الاسلامی، مبارک پور اعظم گڑھ

جب جب حافظِ ملت کا نام لیا جاتا رہے گا تو جذبۂ دینی اور ملی دردمندی کے ایک محسوس پیکر کی دستک ہمارے تصوّرات کے دروازے پر سنائی دے گی۔ حافظِ ملت نام ہے اس ذات کا کہ جس کی حدود کے اندر غفلت شعاری، مصلحت اندیشی اور ضمیر فروشی کو خیمہ زن ہونے کا موقع نہیں ملتا ہے بلکہ وہاں تو وہ اوصاف اور قوتیں پرورش پارہی تھیں کہ ایک عالَم اُن کو حافظِ ملت کہنے پر مجبور ہوگیا۔ ان کی کتابِ زیست کا ورق ورق اُلٹ ڈالیے تو اُن کے شعور اور تحت الشعور میں ان ہی افکار کے نقوش ملیں گے جن کا رشتہ مذھب اور ملت کی تعمیر وترقی سے بڑا گہرا اور مضبوط ہے۔ انہوں نے کوئی بھی قدم ایسا نہیں اُٹھایا کہ جس سے مذھب وملت کے تحفظات گردش میں آجائیں۔ انہوں نے کوئی بھی فکر ایسی پیش نہیں کی کہ اسے اسلامیات سے ہلکے سے تصادم کا بھی سامنا کرنا پڑا ہو۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا مذھب ملت اور قوم کے لیے کیا۔ اس کے لیے کبھی انہوں نے کوئی سودا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی فکر کی اور نہ اپنے خاندان کی اور اس کے لیے جلبِ منفعت کو مطمحِ نظر بنانا تو بہت دور کی بات ہے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

یہ بات مَیں رسماً نہیں تحریر کررہا ہوں بلکہ اس سلسلہ میں لاتعداد شہادتوں اور صداقتوں کا انبار لگا ہوا ہے کہ حافظِ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ والرضوان علم، حسنِ عمل، اخلاص اور دردمندی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ان سے الگ کرلیا جائے تو حافظِ ملت کی شخصیت کی تصویر دھندلی رہے گی بالخصوص اخلاص اور دردمندی کا عکس تو اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ دوسری بہت ساری شخصی تصویریں دھندلی نظر آتی ہیں۔ یہ اُن کی دردمندی اور خلوص ہی کی برکت ہے کہ برصغیر کا سوادِ اعظم ان ہی کی خدمات اور قربانیوں کا رہینِ احسان ہے۔ اُن کے خلوص اور دردمندی کی محسوس شکل آج الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور ہے جس کی تعلیمی، تنظیمی اور تحریکی رگ رگ میں حضور حافظِ ملت کی بے لوث قربانیوں اور ملی وفا شعاریوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ حافظِ ملت کے مقدس خواب کی یہ عملی تعبیر جہاں مذھب اسلام کے اظہار و ترسیل اور فروغ واستحکام کی بساط بچھا چکی ہے وہیں قومِ مسلم اور ملتِ اسلامیہ کی اُجڑی ہوئی فکری بستیوں کو سنوارنے اور زخم رسیدہ روایتوں کو مندمل کرنے میں لگی ہے۔ اور یہ کاروانِ انقلاب نصف صدی سے برابر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور ہر سال حضور حافظِ ملت کے نظریات وتعلیمات کے قافلے انسانی پیکروں میں اس کی ہم رکابی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ گویا حضرت موصوف الذکر علیہ الرحمہ نے الجامعۃ الاشرفیہ قائم فرماکر مذھب کی مردہ رگوں میں زندگی کی حرارت دوڑائی اور تبلیغی ودعوتی سطح پر معاشرے کی

چلتی ہوئی نبض کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شاید اسے کوئی مبالغہ یا جانب داری پر محمول کرے لیکن یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ اٹل ہے کہ آج ہندستان بھر میں تخلیقی سطح پر اہل سُنّت کی جو الگ شناخت اور ان کا پرچم لہرا رہا ہے اس میں زیادہ تر حصہ یا تو حافظ ملت کے تلامذہ کا ہے یا ان کے تلامذہ کے تلامذہ کا اور کیوں نہ ہو کہ مصباحی فاضلان کی یہ ساری مساعی حضرت حافظ ملت کی تعلیمات مبارکہ سے غذا حاصل کرتی ہیں

اب اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ سرکار حافظِ ملت جماعتی اخلاص پروری اور مذہبی وقومی درد مندی کے ایک روشن استعارہ کا نام ہے۔ آپ کے رشتۂ تلمذ ہی کی برکت ہے کہ آپ کے بہت سارے تو نہیں البتہ چند شاگردوں کے فکر و مزاج کے ورق پر اخلاص و درد مندی کی وہی عبارات مرتسم ہیں جو حافظِ ملت کے اندر موجود تھیں بقیہ دوسرے شاگردوں کے ظرف اپنی اپنی بساط بھر ان سے فیضاب ہوئے۔ حافظِ ملّت یقیناً حافظِ ملت ہیں کہ انہوں نے کشتیِ مذھب وملت کی بروقت ناخدائی فرمائی اور ساحل سے ہم کنار کیا۔ ان کی بے پناہ تحریکی، تبلیغی اور تنظیمی خدمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظِ ملت تنہا ایک ذات نہیں بلکہ انجمن تھے، اکیڈمی تھے اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ اُن کی شخصیت کے سمندر میں کود کر تو دیکھیے کہیں کوئی کنارہ نہیں ملے گا کہ اس کی حدود کو تعین کے دھاگے سے باندھا جاسکے اور الفاظ و معانی کی سرحدوں میں گھیرا جاسکے۔

****

بقیہ: حجاب اور تہذیبی و ثقافتی دہشت گردی

سازش بہت ہولناک ہے۔ میرا قلم اس کو لکھنے سے عاجز ہے اس جنگ کو تمہارے بھائی ایک حد تک لڑ سکتے ہیں ...... یہ جنگ تمہیں خود لڑنی ہوگی ...... اور اگر تم اس جنگ میں ثابت قدم رہیں تو قسم خدا کی! تمہاری قوم پھر بامِ عروج پر اپنا جھنڈا لہرائے گی۔

تمہیں ہمت نہیں ہارنی، جنگ شروع ہو چکی اب ہمت کے ساتھ استقامت کے ساتھ اس کے مقابلے کے لیے تیار رہو۔

شکستِ ظلمتِ ہمت شکن مبارک ہو
یہ فتح روشنیِ فکر و فن مبارک ہو
مبارک اہلِ قلم کو قلم کی آزادی
صداقتوں کا دوبارہ چلن مبارک ہو

☆☆☆☆☆

جب مجھے سزائے موت سُنائی گئی

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی لمحہ بہ لمحہ داستان

انٹرویو: مولانا سیّد خلیل احمد قادری

ترتیب: شفقت عثمانی۔ خلیل احمد رانا

تعارف

امین الحسنات مولانا سیّد خلیل احمد قادری، مفسر قرآن حضرت مولانا ابوالحسنات سیّد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ابن مولانا سیّد دیدار علی الوری محدّث لاہوری علیہ الرحمہ (خلیفہ مجاز امام احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہٗ) کے اکلوتے فرزند ارجمند اور اپنے والد محترم کی رحلت کے بعد تادمِ حیات تاریخی مسجد وزیر خاں (لاہور) کے خطیب رہے، مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے دستارِ فضیلت حاصل کی اور طب و حکمت میں اپنے والد ماجد کے مخصوص نسخوں اور طریقِ علاج کے امین رہے۔ آپ نے جوانی کے دور میں دینی تحریکوں میں حصہ لیا۔ "تحریکِ ختم نبوت ۱۹۵۳ء" میں ایک مجاہد کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے، گرفتار ہوئے، لاہور کے قلعہ کے عقوبت خانہ میں رہے، مارشل لاء نے انہیں سزائے موت کا حکم سنایا مگر ثابت قدم رہے۔ تحریکِ ختم نبوت میں ایک طویل عرصہ تک پسِ دیوارِ زنداں رہے، لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس "جامعہ حسنات العلوم" قائم کیا، مسجد کی خطابت کو تادمِ زیست اپنایا، اپنے والدِ مکرم کی تفسیر قرآن "تفسیر الحسنات" کے آخری حصوں کو مکمل کیا اور انہیں چھپوایا۔ مولانا امین الحسنات سیّد محمد خلیل احمد قادری اشرفی خطیب جامع مسجد وزیر خاں لاہور و امیر جامعہ حسنات العلوم کا ایک کتابچہ "عید الضحیٰ مع احکام و مسائلِ قربانی" مطبوعہ لاہور، سن طباعت درج نہیں، صفحات ۴۴، راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ مجاہدِ تحریکِ ختم نبوت مولانا سیّد خلیل احمد قادری اشرفی نے ۲۷ر ذیقعد ۱۴۱۸ھ/ ۲۷ر مارچ ۱۹۹۸ء بروز جمعہ لاہور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجاہد تحریک ختم نبوت امین الحسنات مولانا سیّد خلیل احمد قادری علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں:

۱۹۵۱ء کے اواخر ہی میں مرزائیوں کے اخبار "الفضل" (ربوہ) نے محمود بشیر کی نہایت اشتعال انگیز تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کردیا تھا، سر ظفر اللہ کے وزیر ہونے کے باعث مرزائی اپنے آپ کو بہت زیادہ طاقتور تصور کرنے لگے تھے اور وہ غالباً اس زعم میں بھی مبتلا ہوچکے تھے کہ پاکستان میں ان کے ناپاک عزائم

کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی مؤثر قوت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ''الفضل'' نے سرخیاں جمائیں ''جب تک اپنے دشمنوں کو قدموں پر نہ جھکا لو چین سے نہ بیٹھو''، ''ہمارے پاس عسکری قوت موجود ہے''، ''۱۹۵۳ء گزرنے نہ پائے گا کہ ہم اپنے مخالفین کو مجبور کردیں گے کہ وہ ہمارے قدموں پر آ کر گریں'' وغیرہ وغیرہ۔

ان اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور ان کے سینوں میں ایک لاوا سا پکنے لگا جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ مختلف شہروں سے علما کرام اور دیگر حضرات وفود کی صورت میں میرے والد محترم مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کے پاس آئے اور انہوں نے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا مطالبہ کیا۔ علمائے اہل سنت کے علاوہ دیگر مکاتیب فکر کے اکابر علما مثلاً سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے قبلہ والد صاحب کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کی قیادت کریں۔ یہ سب حضرات اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ والد محترم قبلہ سیّد صاحب کے تحریک پاکستان میں مجاہدانہ کردار اور دیگر قومی و ملی خدمات کے باعث ان کا سوادِ اعظم میں بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ چنانچہ تمام مکاتیب فکر کے زعما نے ان سے تحریکِ ختم نبوت کی قیادت قبول کرلینے پر اصرار کیا، اور پھر برکت علی محمڈن ہال میں ایک عظیم الشان کنونشن کا اہتمام کیا گیا، جس میں تمام مکاتیب فکر کے اکابر علما شریک ہوئے۔ اس موقع پر جلسہ کی صدارت صاحبزادہ غلام محی الدین سجادہ نشین آستانہ عالیہ گولڑہ شریف نے فرمائی جو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار عوامی اجتماع میں تشریف لائے تھے۔ تونسہ شریف اور علی پور شریف کے سجادہ نشین حضرات کے علاوہ ملک بھر سے جید مشائخ اس کنونشن میں شریک ہوئے۔ اس کنونشن میں یہ طے پایا تھا کہ تمام مکاتیب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر تمام جماعتوں نے ابوالحسنات علامہ سیّد محمد احمد قادری کو صدر منتخب کیا، سیّد داؤد غزنوی کو جنرل سیکرٹری کے فرائض سونپے گئے اور دیگر سرکردہ حضرات میں سیّد عطا اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین، شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ فیض الحسن (مجلس احرار) شامل تھے۔ مجلسِ عمل میں جمعیت علما پاکستان کے مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین، جمعیت اہل حدیث کے مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عطاء اللہ حنیف، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، امین احسن اصلاحی اور نصر اللہ خاں عزیز، جمعیت علما اسلام کے مولانا احمد علی لاہوری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ مجلس تحفظِ ختم نبوت کے لال حسین اختر اور محمد علی جالندھری شامل تھے۔ مرکزی تنظیم کے قیام کے بعد صوبائی اور ضلعی کمیٹیاں بنادی گئیں اور مختلف مقامات پر کنونشنوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کنونشنوں میں جو تین مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے ان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، ظفر اللہ سمیت تمام قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے اور ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے پر زور دیا گیا تھا، پنجاب اور ملک کے دوسرے

صوبوں میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

۱۹۵۲ء میں مرکزی انجمن حزب الاحناف کا سالانہ اجلاس مسجد وزیر خاں میں شروع ہوا۔ نمازِ جمعہ کے بعد پہلی نشست سے حضرت علامہ ابوالحسنات نے خطاب کرنا تھا لیکن چند گھنٹے قبل اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب ممتاز دولتانہ نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلسوں وغیرہ پر پابندی عائد کروادی۔ حضرت علامہ ابوالحسنات نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی اور انہوں نے دولتانہ کو چیلنج کیا کہ وہ ختمِ نبوت کی حق آواز کو نہیں روک سکتے۔ انہوں نے نہایت پُرجوش انداز میں فرمایا!

''اگرچہ دولتانہ تحریکِ پاکستان میں ہمارے ہم سفر رہے ہیں لیکن آج کلمۂ حق بلند کرنے کے جرم میں وہ ہمیں بخوشی گرفتار کر سکتے ہیں۔ ہم پاکستان کی بقا اور استحکام کے لیے تحریکِ ختم نبوت کو جاری رکھیں گے''۔

دفعہ ۱۴۴ کی کھلی خلاف ورزی کے باوجود انہیں گرفتار نہ کیا گیا اور سہ روزہ اجلاس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد تحریک چلتی رہی اور اجتماعی جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۵۳ء کے اوائل میں مجلسِ عمل نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد کی صورت میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان سے ملا جائے اور انہیں اپنے مطالبات اور ملکی صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ ابوالحسنات کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی، عطا اللہ شاہ بخاری، سید داؤد غزنوی، صاحبزادہ فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شمسی اور مولانا محسن فقیہ شافعی شامل تھے۔ یہ وفد کراچی پہنچا اور وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے قوم کے مطالبات ان کے سامنے رکھے گئے، خواجہ صاحب نے مطالبات کو سننے کے بعد کہا:

''میرے لیے ان مطالبات کو مان لینا بہت مشکل ہے کیونکہ اگر میں سر ظفر اللہ کو کیبنٹ سے نکال دوں تو امریکہ ناراض ہو جائے گا اور جو امداد پاکستان کو مل رہی ہے وہ بند ہو جائے گی''

قائد وفد علامہ ابوالحسنات نے جواباً فرمایا:

''ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کا ناصر اور رازق اللہ تعالیٰ ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ سب کچھ امریکہ کو سمجھتے ہیں...... حکومت کو ہمارے مطالبات بہر حال منظور کرنا ہوں گے ورنہ ہمیں موجودہ تحریک کو ڈائریکٹ ایکشن کی طرف لے جانا پڑے گا، ہاں البتہ ہم آپ کو سوچنے کے لیے وقت دینے کو تیار ہیں، اس وقت تک ہم تحریک کو نرم رکھ سکتے ہیں''۔

لیکن خواجہ ناظم الدین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے واضح طور پر مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کراچی ہی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں متذکرہ وفد کے ارکان

کے علاوہ مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی بھی شامل تھے۔ اس اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں اور آخری نشست میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۶ر فروری ۱۹۵۳ء کی شام کو نشتر پارک کراچی میں جلسۂ عام کا اعلان کیا گیا۔ مولانا مودودی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط کرنے کے بعد لاہور واپس آگئے اور ۲۶ر فروری کی شام کو پروگرام کے مطابق نشتر پارک میں عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے علاوہ باقی تمام اکابرین نے تقاریر کیں۔ ۲۶ر اور ۲۷ر فروری کی درمیانی شب کو جلسہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ حضرات جب واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ ۲۷ر فروری کو جمعہ کے روز اکابرین کی گرفتاریوں کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ مشتعل ہوکر سڑکوں پر نکل آئے۔ لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا اور مشتعل ہجوم نے مرزائیوں کے اداروں اور ان کے مکانوں کو آگ لگانے کا پروگرام بنایا۔ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد مَیں مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کے ہمراہ اجتماع میں پہنچا اور ہم نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ ۲۷ر اور ۲۸ر فروری کی درمیانی شب مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اگلے روز ۲۸ر فروری کو صبح نو بجے کے قریب مَیں مولانا مودودی سے ملاقات کرکے صورت حال کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے ان کی اقامت گاہ پر پہنچا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس موقع پر موجود تھے، مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کردیا، انہوں نے کہا:

"مولانا احتشام الحق تھانوی کا رات ٹیلی فون آیا تھا، ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز سے انہیں اور مجھے اتفاق نہیں تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تحریک میں حصہ نہ لیں"۔ مَیں نے عرض کی "آپ کے تو دستخط موجود ہیں پھر یہ فیصلہ کیسا؟" مولانا نے جواباً فرمایا: "وہ میٹنگ کا فیصلہ تھا، اب صورت حال مختلف ہے، بہر حال مَیں تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا۔" مولانا عبدالستار خان نیازی نے اس موقع پر اُن سے کہا "لوگ اس وقت بہت مشتعل ہیں اور وہ جذبات میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔ کوئی اُن کی قیادت کرنے والا نہیں، آپ مجلس عمل کے رکن ہیں، اگر اب آپ آگے نہیں آنا چاہتے تو ہمیں اختیار دیجیے تاکہ ہم تحریک چلا سکیں۔" مولانا مودودی ہمیں تحریری طور پر اختیارات دینے پر رضا مند ہوگئے۔ مولانا داؤد غزنوی دل کے عارضہ میں مبتلا تھے، انہوں نے بھی ہمیں اختیارات لکھ کر دے دیے۔ اس کے بعد مَیں مولانا احمد علی لاہوری کے پاس گیا، انہوں نے کہا، "میرا بستر ا بندھا ہوا رکھا ہے، مولانا ابوالحسنات میرے صدر ہیں، میں نے ان کو تار دے دیا ہے اور ان کا جواب ملنے پر مَیں اُن کے حکم کی تعمیل کروں گا۔" اس کے جواب میں مَیں نے کہا، "مولانا ابوالحسنات تو اس وقت جیل میں ہیں، نہ آپ کا تار انہیں پہنچے گا اور نہ ان کا جواب

آپ کو ملے گا، لہذا اگر ٹالنا مقصود ہے پھر تو الگ بات ہے اور اگر آپ کا ارادہ عملاً حصہ لینے کا ہے تو آپ وعدہ فرمائیے۔" انہوں نے کہا، "مَیں تیار ہوں جو حکم مجھے دیا جائے گا مَیں اس کی تعمیل کروں گا۔ اس کے بعد مَیں مفتی محمد حسن (نیلا گنبد) کے پاس گیا تو انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا مَیں ٹانگوں سے معذور ہوں اس لیے عملاً حصہ نہیں لے سکتا۔ مَیں نے اُن سے کہا! "جناب آپ معذور ضرور ہیں لیکن قیامت کے دن میرے آقا، گنبدِ خضریٰ کے مکیں حوضِ کوثر پر جلوہ افروز ہوں گے اور آپ سے فرمائیں گے کہ میرے نام پر کھاتے رہے، عزت کرواتے رہے اور مفتی کہلواتے رہے لیکن جب میری ناموس کا مسئلہ آیا تو معذوری ظاہر کردی، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟" یہ سُن کر مفتی صاحب کا چہرہ متغیر ہوگیا، انہوں نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور پھر کہنے لگے، "آپ مجھے جب چاہیں گرفتار کروادیں، اگر آپ ابھی چاہیں تو میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" اس گفتگو کے بعد میں وہاں سے دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہوا۔

یہاں مَیں نے دیکھا کہ تقریباً ایک لاکھ افراد کا جم غفیر موجود تھا اور لوگ منتظر تھے کہ کوئی انہیں پروگرام بتائے۔ مَیں وہاں سے فوراً مولانا غلام دین صاحب خطیب انجن لوکوشیڈ کے پاس پہنچا، اس وقت ظہر کا وقت تھا اور مولانا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اُن سے کہا! "مولانا آپ کو آج ہی اور اسی وقت گرفتاری پیش کرنا ہے۔" مولانا نے بلاحیل و حجت فرمایا "نماز پڑھ لوں یا پہلے چلوں" میں نے عرض کی "وہاں لوگ منتظر ہیں، نماز آپ وہیں پڑھیں اور تقریر کے بعد جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دیں۔" مولانا نے گھر پر اطلاع دے دی اور فوراً میرے ساتھ دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہولیے، وہاں پہنچ کر انہوں نے نمازِ ظہر پڑھائی اور ایک نہایت ایمان افروز تقریر فرمائی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دے دی۔

اسی روز شام کو مسجد وزیر خاں میں رضا کاروں کا اجتماع شروع ہوگیا، مَیں بھی بستر لے کر مسجد وزیر خاں پہنچ گیا اس کے بعد پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا کہ صبح دس بجے مسجد وزیر خاں میں اجلاس ہوتا اور دس رضا کار جلوس کے ساتھ گرفتاریاں پیش کرتے اور نمازِ ظہر کے بعد دہلی دروازہ کے باغ سے (جو اس وقت اکبری دروازہ تک پھیلا ہوا تھا) دس رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے، روزانہ گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی قیادت کوئی ایک عالم دین کرتا تھا، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا بہاء الحق قاسمی بھی میرے ساتھ مسجد وزیر خاں میں تھے۔ ۲۹/ فروری کو مولانا احمد علی لاہوری نے دہلی دروازے کے اجلاس میں تقریر کرکے گرفتاری پیش کی۔

ظفر علی خاں کے صاحبزادے اور "زمیندار" کے ایڈیٹر اختر علی (جو کہ مجلس عمل کے خازن بھی تھے) نے پہلے تو تحریک کی پُر زور حمایت کی لیکن جب دولتانہ وزارت کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا تو ان کا

رویہ بدل گیا۔ عوام نے "زمیندار" کی کاپیاں جلا کر احتجاج کیا، اور پھر ۳۰ر فروری کی شام کو مشتعل ہجوم نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔ انہوں نے جان بچانے کے لیے برقعہ پہنا اور گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر مسجد وزیر خاں پہنچ گئے اور اگلے روز انہوں نے بھی تقریر کر کے گرفتاری پیش کر دی۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں رضا کاروں کا ایک جلوس دہلی دروازے سے حسب معمول نکلا اور جب یہ جلوس برانڈرتھ روڈ پہنچا تو پولیس نے بلا جواز سخت تشدد کیا، جس کے باعث بہت سے رضا کار شدید زخمی ہو گئے۔ ہم نے مسجد وزیر خاں میں ڈسپنسری کا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا، چنانچہ ان کا علاج شروع ہو گیا۔ اسی دوران شہر میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ ڈی ایس پی فردوس شاہ نے قرآن پاک کی توہین کی ہے۔ چنانچہ اگلے روز ظہر کے اجلاس میں ایک صاحب نے مجمع عام میں قرآن پاک کے پھٹے ہوئے اوراق پیش کیے جس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور ان کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔

چوک وزیر خاں کے قریب پولیس کا ایک سپاہی کشمیری بازار کی طرف سے آ رہا تھا، لوگوں نے اسے گھیر لیا، اس نے جان بچانے کے لیے ایک قریبی مکان میں پناہ لی، جب وہ کھڑکی سے باہر سر نکالتا تو لوگ نعرے لگاتے، یہ خبر ڈی ایس پی فردوس شاہ تک پہنچی تو وہ اس سپاہی کو بچانے کے لیے ایک گارڈ کے ہمراہ چوک وزیر خاں کی طرف چلا اور پھر اس کا ایک مشتعل جلوس سے آمنا سامنا ہو گیا۔ کسی شخص نے زور سے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے قرآن پاک کی توہین کی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ پورا جلوس ان پر پل پڑا اور ان کو وہیں قتل کر دیا گیا۔ درحقیقت یہ ساری واردات حکومت نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کروائی تھی، کیونکہ دولتانہ وزارت چاہتی تھی کہ اسے تشدد کا کوئی بہانہ ہاتھ آئے تاکہ تحریک کو کچلا جا سکے، چنانچہ اس واقع کے بعد وسیع پیمانے پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور رات بھر گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں، فردوس شاہ کے قتل کے بعد کرفیو لگا دیا گیا تھا، لیکن ہم نے مسجد وزیر خاں کا اجلاس جاری رکھنے اور بدستور گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا، اسی روز مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین، حافظ خادم حسین صاحب اور مولانا احمد علی لاہوری کو ہتھکڑیاں لگا کر لاہور سے ملتان لے جانے کے لیے اسٹیشن پر لایا گیا، جس سے عوام کا اشتعال اور زیادہ بڑھ گیا، رات کو مسجد وزیر خاں میں میری صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کی اشتعال انگیز کاروائیوں کی مذمت کی گئی۔

تحریک کی نظامت اس وقت میرے پاس تھی۔ حکومت کے کچھ نمائندے میرے پاس آئے اور انہوں نے دورانِ گفتگو بتایا کہ دولتانہ حکومت نے آپ کے مطالبات منظور کر لیے ہیں اس لیے آپ تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ میں نے جواباً انہیں یہ بتایا کہ تحریک کی باگ ڈور اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ان لوگوں کے پاس ہے جو کراچی اور سکھر جیل میں محصور ہیں۔ لہٰذا آپ ان سے رابطہ قائم

کیجیے، اگر انہوں نے ہمیں تحریک ختم کرنے کا حکم دے دیا تو ہم کوئی پس و پیش نہیں کریں گے، بصورت دیگر ہم پوری قوت کے ساتھ مطالبات منوانے کے لیے جدو جہد جاری رکھیں گے۔ اس کے بعد حکومت کے نمائندے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

۳؍مارچ کو مسجد وزیر خاں میں مسلم لیگ کی کچھ خواتین آئیں، انہیں دراصل ایک سازش کے تحت بھیجا گیا تھا تا کہ کوئی ہنگامہ آرائی ہو اور تشدد کرنے کا بہانہ ہاتھ آسکے، لیکن ہم نے عوام پر کنٹرول کرتے ہوئے ان خواتین کو مسجد سے محفوظ جگہ تک پہنچا دیا اور اس طرح حکومت کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔ مسجد وزیر خاں میں ہر روز بعد نمازِ عشاء بھی جلسہ عام کا اہتمام ہوتا تھا جس میں بڑی ایمان افروز تقاریر ہوتیں۔

۵؍مارچ تک تحریک نے پورے پنجاب میں زور پکڑ لیا تھا۔ سندھ اور سرحد میں بھی ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا۔ ۴؍مارچ ۱۹۵۳ء کو سارا دن گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ جس مکان سے ختمِ نبوت کی آواز بلند ہوتی اس کے مکینوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ ۴؍مارچ کی رات کو مسجد وزیر خاں کے اجلاس میں ہم نے ''پہیہ جام ہڑتال'' کا اعلان کر دیا۔ انتہائی مختصر نوٹس کے باوجود اس اپیل کے نتیجے میں اگلے روز ایسی شاندار ہڑتال ہوئی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ اخبارات میں خبر پڑھنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس سیکرٹریٹ کے سرکاری ملازمین نے بھی قلم چھوڑ دیے۔ کسی بس یا ٹرک کا تو ذکر ہی کیا تانگہ یا رکشہ تک نظر نہ آتے تھے، غرض کہ اس ہڑتال نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

۵؍مارچ کی شام کو پورے ملک میں ایک عجیب سناٹا تھا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں تھانوں پر شمع ختمِ نبوت کے پروانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ دولتانہ کی صوبائی اور خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی روز پولیس نے دہلی دروازے کے اجلاس پر پابندی عاید کر دی اور لوگوں کو اس میں شرکت سے روکا۔ جب پولیس کو کامیابی نظر نہ آئی تو اس نے گولی چلا دی۔ اس موقع پر محمد عربی ﷺ کے غلاموں نے سینے تان تان کر گولیاں کھائیں اور جامِ شہادت نوش کیا۔ مسجد وزیر خاں زخمیوں اور شہدا سے بھر چکی تھی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہدا کے کفن دفن کا انتظام بڑی سرگرمی سے جاری تھا۔ ایک عجیب منظر تھا، ہر طرف خون میں نہائے ہوئے نوجوان لیٹے تھے۔ اس موقع پر عوام کے تعاون کا یہ عالم تھا کہ خوراک اور مالی امداد کے علاوہ جس چیز کی بھی اپیل کی جاتی فوراً مہیا ہو جاتی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کے لیے کثیر تعداد میں ڈاکٹر اور ڈسپنسر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے رضا کارانہ طور پر تمام خدمات انجام دیں۔ اس روز تقریباً چالیس مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا اور سینکڑوں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔ شہدا کو تدفین کے لیے جلوس کی شکل میں قبرستان میانی صاحب اور دیگر قبرستانوں میں لے جایا گیا۔ دو شہدا کی قبریں سنہری

مسجد کشمیری بازار کے عقب میں بنادی گئیں۔ اس وقت ملتِ اسلامیہ کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ انہیں مرنے مارنے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ ہماری طرف سے لوگوں کو پُر امن طور پر احتجاج کرنے کی اپلیں مسلسل کی جارہی تھیں۔

دولتانہ وزارت نے اس موقع پر ایک اور چال چلی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے اشتہارات پھینکے گئے کہ حکومت نے مطالبات منظور کرلیے ہیں اور تحریک ختم ہوگئی ہے۔ لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ ہوسکی اور عوام حکومت کے ہتھکنڈے کو فوراً سمجھ گئے۔

۶ر مارچ کو جنرل اعظم کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ یہ مارشل لاء انتہائی سخت تھا اور ریڈیو سے دھمکی آمیز اعلانات نشر ہورہے تھے۔ دن کے بارہ بجے ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا ''مولانا عبدالستار خاں نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کردیں ورنہ انہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی'' مولانا عبدالستار خان نیازی اس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ اس مسئلہ پر اسمبلی میں تقریر کریں۔ اسمبلی کا اجلاس چند روز میں ہی شروع ہونے والا تھا، چنانچہ ہم نے مولانا عبدالستار نیازی خاں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچادیں۔ مولانا نیازی نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ مولانا نیازی چند افراد کے ہمراہ مسجد کے مغربی اور جنوبی مینارہ سے متصل مکان میں منتقل ہوئے اور پھر دیہاتیوں کا سا لباس پہن کر لاہور سے باہر چلے گئے۔ اس موقع پر تحریک دشمن عناصر نے یہ افواہیں پھیلائیں کہ مولانا نیازی دیگ میں بیٹھ کر گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے داڑھی منڈوالی ہے۔ یہ افواہیں صرف تحریک کو ناکام بنانے کے لیے پھیلائی گئیں اور پولیس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے انہیں ہوا دی حالانکہ ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

۶ر مارچ کو مسجد وزیر خاں میں تقریباً تین چار ہزار رضا کار موجود تھے۔ مسجد میں پروگرام کے مطابق اجلاس ہوتے رہے اور ۵، ۶ رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔ ۷ر مارچ کو نماز ظہر کے بعد مسجد میں اجلاس ہورہا تھا اور رضا کار جلوس کی تیاری کررہے تھے کہ مسجد سے متصل سڑک پر جنرل محمد ایوب خاں (جو بعد میں سربراہ مملکت بھی بنے) چند دیگر فوجی افسران کے ہمراہ آئے اور انہوں نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ مولانا خلیل احمد قادری اور مسجد کے اندر موجود تمام رضا کار خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیں ورنہ ہم انہیں مسجد کے اندر داخل ہوکر گرفتار کرلیں گے اور اس طرح جو کشت و خون ہوگا اس کی ذمہ داری انہی افراد پر ہوگی۔ اس کے جواب میں مَیں نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کی اور حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ پیش کیا کہ جب بادشاہِ وقت نے اپنی بیگم زبیدہ کو ان الفاظ میں مشروط طلاق دی کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میری سلطنت سے باہر چلی جاؤ ورنہ تم پر میری طلاق ہوجائے گی۔ غصے

کے عالم میں تو بادشاہ نے یہ بات کہہ دی لیکن جب غصہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہوگیا اور اس نے علما سے فتویٰ پوچھا۔ علما نے جواب دیا کہ حدودِ سلطنت سے نکلنا لازم ہے ورنہ طلاق ہوجائے گی۔ حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے سارا واقعہ سننے کے بعد فرمایا کہ بادشاہ سے کہو وہ بے فکر ہوجائے سورج غروب ہونے سے پہلے اس کی بیگم اس کی حدود سے نکل جائے گی اور یہ شرط پوری ہوجانے کے بعد طلاق نہیں ہوگی۔ سورج غروب ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تو بادشاہ بہت گھبرایا اور اس نے اپنے نمائندے دوبارہ امام صاحب کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے فرمایا کہ بیگم کو مسجد میں لے آؤ اور علما سے پوچھ لو کہ مسجد بادشاہ کی حدودِ مملکت سے باہر ہے یا نہیں؟ چنانچہ بیگم صاحبہ کو مسجد میں لایا گیا اور تمام علما نے بالاتفاق یہ فیصلہ دے دیا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی مملکت نہیں ہے۔ اور اس طرح طلاق نہیں ہوئی۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ مسجد خانۂ خدا ہے اور اگر مارشل لاء حکام نے مسجد میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو اس کا بڑی سختی سے جواب دیا جائے گا اور تمام تر ذمہ داری فوجیوں پر عاید ہوگی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ فوج اور پولیس کو مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کے بعد خدا کے فضل وکرم سے فوجی افسران کسی کارروائی کے بغیر ہی واپس چلے گئے۔ اس موقع پر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ ایک مرزائی فوجی افسر نے مسجد کو ڈائنا مائیٹ سے اُڑا دینے کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن وہ ناکام رہا اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ اس روز بھی حسب معمول جلسہ ہوا اور رضا کاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔

ریڈیو اور اخبارات پر حکومت کا مکمل کنٹرول تھا اور ہمارے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا جارہا تھا لیکن اس موقع پر مولانا سیّد محمود احمد رضوی (لاہور) اور ان کے رفقا نے تحریک کی حمایت میں اشتہارات سائیکلو اسٹائل کر کے شہر کے مختلف حصوں میں لگانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔ حکومت نے مسجد وزیر خاں میں کچھ ایسے افراد بھیج دیئے تھے جو رضا کاروں کے حوصلے پست کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

۸؍ مارچ کو فجر کی نماز کے بعد جب کرفیو کھلا تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اعلان کیا کہ ہم لوگ ناموسِ مصطفےٰ کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں لہٰذا جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی کمزوری محسوس کرتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے وہ جاسکتا ہے، وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری۔ میری تقریر کے بعد مسجد میں صرف ڈیڑھ ہزار جانثار رہ گئے اور باقی سب گھروں کو چلے گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کی بجلی اور پانی بند کردیا گیا تھا اور خوراک کے تمام راستے بھی مسدود تھے، لیکن ہمارے پاس مسجد کے حوض میں پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا، اس کے علاوہ گڑ اور چنے کی بوریاں ہم نے پہلے سے ہی مسجد میں محفوظ کرلی تھیں۔ چنانچہ یہ خوراک استعمال

کی گئی۔ امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ دوپہر کے وقت میرے پاس آئے اور انہوں نے گورنر پنجاب نواب چندریگر کا یہ پیغام مجھے دیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں نے مسجد سے باہر نکلنے سے انکار کردیا اور وہ واپس چلے گئے۔

۸؍مارچ کی شام کورنگ محل، شیرانوالہ گیٹ اور موچی دروازہ سے مسجد تک ریت کی بوریاں چن دی گئیں اور خار دار تار بچھا دیئے گئے تاکہ نہ تو کوئی مسجد کے اندر آسکے اور نہ کوئی واپس جا سکے۔ مسجد کے شمالی اور مغربی حصے کے مکانات خالی کروا کر اُن پر اسٹین گنیں اور دیگر ہتھیار نصب کر دیے گئے۔ رات بھر مسجد میں ذکرِ الٰہی جاری رہا، نعرہ ہائے تکبیر و رسالت اور ختمِ نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعرے فضا میں گونجتے رہے۔

۹؍مارچ کو صبح دس بجے امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ میرے پاس دوبارہ تشریف لائے، موصوف تحریک پاکستان راہنما اور قبلہ والد صاحب کے دوست تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سارے شہر میں فوج کا کنٹرول ہوچکا ہے اور اگر آپ نے مزاحمت جاری رکھی تو جانوں کا بھی نقصان ہوگا اور مسجد کی بے حرمتی کا بھی خطرہ ہے۔ قدوائی صاحب سے گفتگو کے بعد مَیں نے رضا کاروں سے مشورہ کیا تو فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے مَیں اپنی گرفتاری پیش کردوں۔ چنانچہ مَیں گرفتاری پیش کرنے کے لیے قدوائی صاحب کے ہمراہ مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر آیا۔ ایک کرنل، دو کیپٹن اور کثیر تعداد میں فوجی باہر موجود تھے۔ انہوں نے پستول اور ریوالور ہماری طرف کرکے ہم کو گھیرے میں لے لیا، مَیں ہنس پڑا اور اُن سے کہا! مَیں تو خود گرفتاری پیش کررہا ہوں، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ کرنل نے جواب دیا، آپ ہم کو مسلمان نہیں سمجھتے، آپ نے مسجد میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے اور میناروں پر پوزیشن لی ہوئی ہے اس لیے یہ کچھ کرنا پڑا۔ مَیں نے اس کرنل کو کہا! اگر آپ مرزائی ہیں تو پھر یقیناً مسلمان نہیں اور اگر مسلمان ہیں تو پھر کسی مسلمان کو غیر مسلم سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ رہا مسجد میں پوزیشن سنبھالنے اور اسلحہ جمع کرنے کا سوال تو یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی، دروازے کھلے ہیں اور آپ اندر جاکر دیکھ سکتے ہیں۔ اس پر وہ ہنس پڑا اور اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا، قدوائی صاحب بھی میرے ہمراہ تھے، کپڑے جو مَیں نے پہن رکھے تھے کافی پھٹ چکے تھے، کیونکہ ۲۸؍فروری کو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد مجھے گھر جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جب مجھے خرادی محلہ کی طرف لایا گیا تو مَیں نے فوجیوں سے کہا کہ میرا مکان قریب ہے اگر آپ اجازت دیں تو مَیں کپڑے تبدیل کرلوں۔ کرنل نے رضا مندی ظاہر کردی، لیکن جب ہم چند قدم آگے آئے تو کرفیو کے باوجود عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے نعرے لگانے شروع کردیئے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کرنل نے مجھے کہا، اب آپ ہمارے ساتھ چلیں، کپڑے ہم بعد میں آپ کو منگوا دیں گے۔ چوہٹہ مفتی باقر سے ہمیں پُرانی کوتوالی لایا گیا، یہاں تک ہم پیدل ہی آئے، پرانی کوتوالی میں فوجیوں

نے بڑے بڑے وائرلیس لگا رکھے تھے۔ انہوں نے وائرلیس پر اپنے ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی کہ ملزم کو پکڑ لیا گیا ہے اور اسے ہم لے کر آرہے ہیں۔ پھر ہمیں پرانی کوتوالی سے دہلی دروازے تک پیدل ہی لایا گیا۔ ہمیں زیر حراست دیکھ کر لوگ مکانوں کی چھتوں سے نعرے لگانے لگے۔ دہلی دروازے سے جیپ میں بٹھا کر شاہی قلعہ کی طرف لے جایا گیا۔ مارشل لاء حکام کو ہماری گرفتاری کی اطلاع تو ہو ہی چکی تھی، شاہی قلعہ میں داخل ہوئے تو عام خاص دربار کے بالائی حصے میں تین چار لمبے لمبے قد والے فوجی افسران کو بیٹھے ہوئے دیکھا، پھر وہ نیچے آئے میز اور کرسیاں بچھائی گئیں اور وہ فوجی افسران کرسیوں پر بیٹھ گئے (غالباً ایک فوجی افسر کا نام سرفراز تھا)۔ مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ قدوائی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک فوجی افسر نے سب سے پہلا سوال مجھ پر کیا کہ کیا آپ غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور یہ تحریک کسی ملک کے ایما پر چلائی جارہی ہے؟ مَیں نے جواباً کہا، ۱۹۴۷ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں خضر وزارت کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا تھا کیا وہ بھی غیر ملکی سازش تھی؟ جن لوگوں نے اس تحریک میں گرفتاریاں پیش کیں کیا وہ بھی غیر ملکی ایجنٹ تھے؟ ہماری تحریک تو ان لوگوں کے خلاف ہے جو غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور مذہبی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کے دشمن ہیں، ان لوگوں نے بانی پاکستان قاید اعظم کی نماز جنازہ تک پڑھنے سے گریز کیا، آج یہ لوگ ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوگئے ہیں، ہم نے یہ تحریک ان کو کلیدی عہدوں سے علیحدہ کرنے کے لیے چلائی ہے۔

پھر اس فوجی افسر نے دوسرا سوال کیا کہ کیا آپ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے؟ مَیں نے جواب دیا "نہیں"۔ اس نے پوچھا، کیوں؟ مَیں نے جواب دیا، سرکار دوجہاں ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہوچکا ہے اور قادیانیوں نے ایک بناسپتی نبی پیدا کرلیا ہے اور ان کا فقہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہے، ضابطہ اخلاق بھی جدا ہے اور سیاسی نظام بھی مختلف ہے۔ اُس نے پوچھا، فقہ کیسے علیحدہ ہے؟ مَیں نے جواباً کہا زانی کو ہم مسلمان حکم قرآنی کے مطابق کوڑوں کی سزا کا حق دار سمجھتے ہیں اور قادیانیوں نے زنا کی سزا دس جوتے مقرر کی ہے جو زانیہ زانی کو لگاتی ہے۔ اس طرح قادیانیوں نے زنا کا بھی دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ جواب سن کر تو وہ آگ بگولہ ہوگیا اور اس نے انگریزی میں گالیاں دینی شروع کردیں۔

قدوائی صاحب نے اسے ٹوکا تو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی، فوجی افسر نے قدوائی صاحب کو کہا، اب تم بھی اپنے آپ کو گرفتار سمجھو میں تمہارے ساتھ نپٹ لوں گا۔ قدوائی صاحب نے اس سے پوچھا، کیا آپ قادیانی ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ پورا ملک قادیانیوں کا ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ تقریباً ایک بج چکا تھا اور ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی، پھر کرسیاں اُٹھالی گئیں اور ہم نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف پٹھان فوجی ہماری نگرانی کررہے تھے، اسی دوران ظہر کا وقت ہوگیا اور ہم نے وضو کے لیے پانی مانگا،

ہمیں شمالی حصے میں لایا گیا جہاں نلکا لگا ہوا تھا، وہاں سے وضو کرنے کے بعد مَیں نے اذان دی، اذان کی آواز سن کر کچھ فوجی اور کچھ رضا کار جو پہلے ہی گرفتار ہو کر آئے ہوئے تھے، نماز پڑھنے کے لیے آ گئے۔ چنانچہ مَیں نے امامت کروائی اور سب نے باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مَیں نے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی۔ دعا کے بعد فوجی میرے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے گرفتاری کی وجوہات پوچھیں۔ مَیں نے قادیانیوں کا پول کھولا اور تحریک کا پس منظر بیان کیا۔ میری باتیں سن کر فوجیوں نے اپنی چادریں بچھا دیں اور نہایت محبت کے ساتھ پیش آئے۔ ایک فوجی میس میں گیا اور ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ پھر ہم نے نمازِ عصر بھی اسی طرح باجماعت ادا کی، نمازِ عصر کے بعد پہلے فوجیوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کر دی گئیں اور نئے فوجی آ گئے۔ انہوں نے پھر ہمیں نیچے بٹھا دیا اور نہایت سختی کا مظاہرہ کیا، ہلنے تک کی ممانعت تھی۔ نماز مغرب کا وقت ہوا تو مَیں نے پھر اسی طرح اذان دی اور باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا میں مشغول ہو گیا۔ یہ نئے فوجی بھی دعا سے بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے بھی ہم سے سوالات کیے، ہم نے تفصیلات بتائیں تو ان کا رویہ فوراً بدل گیا اور وہ بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ نمازِ مغرب کے بعد مجھے اور قدوائی صاحب کو جیپ میں بٹھا کر مغربی حصے میں واقع سی آئی اے کے دفتر میں لایا گیا، جہاں ہمارا نہایت فحش اور غلیظ گالیوں سے استقبال ہوا۔ قدوائی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مجھے اوپر کے حصے میں لے جا کر ایک چھوٹی سی حوالات میں بند کر دیا گیا جس میں پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ رات کو مجھے کھانا بھی نہیں دیا گیا اور مَیں بھوکا ہی سو گیا۔

حوالات کے قریب کوئی سپاہی نہیں تھا جس سے پانی مانگا جا سکے۔ چنانچہ اگلے روز فجر میں نے تیمم کر کے ادا کی۔ نماز کے بعد مَیں نے قدوائی صاحب کی آواز سنی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ نچلے حصے کی حوالات میں ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص ایک کپ چائے اور ایک چھوٹی سی روٹی رکھ کر چلا گیا۔ مَیں نے اسے غنیمت جان کر ناشتہ کیا، دس گیارہ بجے کے قریب سی آئی اے کا ایک افسر آیا اور مجھے حوالات سے نکال کر اپنے دفتر میں لے آیا۔ چھوٹے قد کے اس افسر کا نام غالباً چوہدری اصغر تھا۔ اس نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ مَیں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ درحقیقت مجھے اس وقت مولانا کے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، جب میں کچھ نہ بتا سکا تو اس نے مغلظات سنانا شروع کر دیں۔ کچھ دیر تو مَیں خاموشی سے سنتا رہا لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے اس سے کہا، وہ میرے بزرگوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کرے ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ بات سننے کے بعد وہ بکتا ہوا چلا گیا اور مجھے ایک دوسری حوالات میں تنہا بند کر دیا گیا۔ شام کے وقت سی آئی اے کا ایک اور افسر آیا اور اس نے دفتر میں لے جا کر قدرے نرمی سے تحریک کے متعلق سوالات پوچھے، جس کے مَیں نے مناسب جوابات دیے۔ پوچھ گچھ کا یہ

سلسلہ تقریباً ۱۵ر مارچ تک جاری رہا، اس دوران مجھے قیدِ تنہائی میں ہی رکھا گیا۔ دوپہر اور شام کو دال روٹی دی جاتی۔ ایک روز مجھے جب حوالات میں بند کرنے کے لیے لے جایا گیا تو متصل حوالات میں مفتی محمد حسین نعیمی نظر آئے۔ ہم دور سے ہی ایک دوسرے کو سلام کر سکے اس سے زیادہ کی اجازت نہ تھی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ گرفتاری کے اگلے روز ہمارے مکان پر چھاپہ مارا گیا۔ اس زمانے میں جمعیت علماے پاکستان کا مرکزی دفتر ہمارے گھر میں ہی تھا۔ مرزائیوں کے خلاف سارا لٹریچر، جمعیت کی فائلیں، لاؤڈ اسپیکر، سائیکلو اسٹائل مشین اور کئی دوسری چیزیں پولیس نے قبضہ میں لے لیں۔ اس وقت مکان پر مستورات کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ مستورات کو پردے میں کرادیا گیا اور دفتری سامان کے ساتھ ساتھ گھریلو سامان کی بھی تلاشی لی گئی۔

۱۵ر مارچ سے ۲۵ر مارچ تک معمول یہ رہا کہ دن کے وقت مجھے قید تنہائی میں رکھا جاتا اور رات کو تقریباً دس گیارہ بجے تیز روشنی میں بٹھا کر نہایت بدتمیزی سے سوالات کیے جاتے۔ اس کے بعد مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ حوالات کی پچھلی طرف ایک کھائی تھی اس میں فائر کیے جاتے اور پھر ایک افسر سپاہیوں سے پوچھتا آج کتنے اُتارے؟ سپاہی جواب میں چار یا چھ کہتا اور پھر مجھے کہا جاتا اب آپ کی باری بھی آنے والی ہے۔ پھر پوچھ گچھ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک تہہ خانے میں لے جایا جاتا اور وہاں اوٹ پٹانگ سوالات کر کے پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اسی دوران ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز مجھے تہہ خانے میں اُتارا جارہا تھا، جب تین چار سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میں نے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا سانپ پھن پھیلائے فرش پر پڑا ہے۔ میرے ساتھ آنے والے افسر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر مَیں نے معافی نہ مانگی تو مجھے اس سانپ کے اُوپر ڈال دیا جائے گا۔ مَیں نے اپنے حوصلے کو قائم رکھا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کردیا۔ اُس نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی تو مَیں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور سے نیچے کی طرف لڑھک گیا اور پھر بدحواسی کے عالم میں اوپر کی طرف بھاگا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی، جب مجھے حوالات میں بند کرنے کے لیے پولیس کی بارک کے سامنے سے گزارا گیا تو مَیں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مَیں نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور پھر ہتھکڑی کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا، میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں نے اس کی وجہ پوچھی تو مَیں نے انہیں کہا خدا کا شکر ہے کہ مَیں نے یہ ہتھکڑیاں کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں پہنیں اور مجھے فخر ہے کہ مَیں نے آج اللہ کے پیارے حبیب شافع محشر ﷺ کی ناموس اور عظمت کے تحفظ کی خاطر یہ زیور پہنا ہے۔ یہ سن کر وہ سپاہی خاصے متاثر ہوئے اور انہوں نے کہا، دل تو ہمارے آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہم کر کچھ نہیں سکتے، ملازمت کا معاملہ ہے۔ مَیں نے اُن سے کہا یزیدی فوج بھی یہی کہتی تھی۔ اگر تم مجھے حق پر سمجھتے ہو تو اسوۂ حر رضی اللہ

عنہ پر عمل کرو، یہ سن کر وہ شرمندہ ہوگئے۔

۳۰ر مارچ کو حوالات میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مغرب کی جانب سے ایک کوّا اڑتا ہوا آرہا ہے اور اس کے منہ میں ایک چھوٹا سا سانپ ہے۔ یہ کوّا اُڑتا ہوا دوسری سمت چلا گیا۔ جب مَیں بیدار ہوا تو اس خواب کا اثر ذہن پر موجود تھا۔ مَیں اس خواب کی تعبیر سوچنے لگا۔ چند لمحے بعد ماشکی گھڑے میں پانی ڈالنے کے لیے آیا تو اس نے بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہوگئی ہے۔ یکم اپریل کو ایک افسر نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ کے والد نے معافی مانگ لی ہے اور وہ گھر واپس آگئے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی معافی مانگ لیں، مَیں اس کی چال فوراً سمجھ گیا اور مَیں نے کہا، مَیں ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہوں، آپ غلط بیانی کر رہے ہیں میرا والد ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا۔ میرا جواب سن کر وہ ناکام واپس چلا گیا۔

۲ر اپریل سے اذیت کا سلسلہ اور بڑھا دیا گیا۔ رات دن مجھے قلعے کے مختلف حصوں میں تبدیل کردیا جاتا۔ رات کو جگایا جاتا اور تیز روشنی میں بٹھا کر ایک افسر سوال کرتا، ابھی مَیں اس کا جواب دینے نہ پاتا تھا کہ دوسرا سوال کردیا جاتا۔ حوالات کے دروازے پر رائفل بردار فوجی ہر وقت موجود رہتے تھے، اگر میں ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ گردن ہلا کر معذرت کا اظہار کردیتے تھے۔ ماشکی گھڑے میں پانی لاکر ڈالتا اور خاموشی سے واپس چلا جاتا۔ گویا وہ ماحول صُمٌّ بُکْمٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْن کا سا تھا، لیکن حوصلہ اور ہمت اس لیے بلند تھی کہ تاجدارِ ختمِ نبوت کی ناموس کا معاملہ تھا۔ ایک روز میرے اصرار پر ایک پہرے دار فوجی نے بتایا کہ انہیں سختی سے آرڈر ہے کہ میری نقل وحرکت کی نگرانی کی جائے اور میرے ساتھ کوئی بات نہ کی جائے۔ اُس نے بتایا کہ اگر کسی افسر نے اسے میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تو اس کا کورٹ مارشل ہوجائے گا۔

۷ر اپریل کی شب مجھے قلعے کے اندر ایک بڑی حوالات میں لے جایا گیا، یہاں مختلف علاقوں کے رضا کار موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر یہ انکشاف ہوا کہ مسجد وزیر خاں میں جوشیلے نعرے لگانے اور سائے کی طرح ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے والے رضا کار دراصل سی آئی ڈی کے ملازم تھے۔ سی آئی ڈی کے کچھ ملازم اس حوالات میں بھی ہماری جاسوسی کے لیے موجود تھے۔ رضا کاروں کے اس اجتماع میں کئی شناسا چہرے بھی تھے۔ لاہور کے علاوہ راولپنڈی اور کراچی کے وہ کارکن بھی موجود تھے جنہوں نے تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ یونس پہلوان اور ان کے ساتھیوں سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ ایک مدت کے بعد کارکنوں سے گفتگو کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا، چنانچہ ہم سب رات تین بجے تک تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرتے رہے۔ سی آئی ڈی کے ملازم پوری توجہ سے ہماری گفتگو سنتے رہے، لیکن اب چونکہ ان کے چہرے بے نقاب ہوچکے تھے اس لیے ہم نے بڑے محتاط انداز میں باتیں کیں۔ پھر اچانک

ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے میرا نام پکارا۔ پھر اس نے یونس پہلوان اور بلال گنج کے کارکن غلام نبی کا نام بھی پکارا اور کہنے لگا کہ مزنگ میں ایک قتل ہوا ہے اور اس میں آپ تینوں کا نام بھی آرہا ہے، لہٰذا آپ ہمارے ساتھ چلیں اور اپنی صفائی پیش کریں۔ ہمیں یہ بات سن کر بہت حیرانی ہوئی اور ہم نے اسے جواباً کہا کہ ہم نو مارچ سے قلعے میں بند ہیں اور باہر کرفیو لگا ہے، قتل کرنے کے لیے ہم کیسے چلے گئے؟ ہم نے پولیس افسر پر واضح کردیا کہ ہم رات کے وقت کہیں جانے کو تیار نہیں ہیں اور اگر اس نے کوئی انکوائری کرنی ہے تو صبح آئے۔ ہمارا جواب سن کر اس نے کہا کہ وہ اپنے افسرانِ بالا کو بتادے گا اور اگر انہوں نے اسی وقت بلایا تو پھر ہمیں بلاحیل و حجت چلنا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

۸/ اپریل کو عصر کے بعد ڈی ایس پی، سی آئی اے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کاغذ اور قلم میرے سامنے رکھ دیا اور مجھے کہا کہ میں جو کچھ بھی چاہتا ہوں کاغذ پر لکھ دوں۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ تو اُس نے جواب میں مغلظات سنانا شروع کردیں۔ میں یہ گالیاں برداشت نہ کرسکا اور مَیں نے اسے کہا آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں لیکن میرے بزرگوں کو گالی نہ دیں ورنہ آپ کو بڑی سخت سزا ملے گی کیوں کہ میرے بزرگوں کا تعلق اہلِ بیت سے ہے۔ یہ باتیں سن کر وہ مرعوب سا ہوگیا۔ اس کے بعد فائرنگ کی آواز آئی اور پھر دو سپاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ ڈی ایس پی نے ان سے پوچھا آج کتنے اُتارے؟ انہوں نے جواب دیا ''دو''۔ سپاہی واپس چلے گئے اور پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ ڈی ایس پی نے فون اُٹھایا اور پھر وہی سوال دہرایا، اب کتنے اُتارے؟ اور پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا اب مزید چار افراد کو گولی ماردی گئی ہے۔ حکومت کے باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اور پھر اس نے بڑی لجاجت سے کہا آپ تو شریف آدمی ہیں اس کاغذ پر معافی نامہ لکھ دیجیے، ہم آپ کو ابھی رہا کروادیں گے۔ مَیں نے اسے جواب دیا کہ جو حکومت ختمِ نبوت کی منکر ہو اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی باغی ہو مَیں اس سے ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا۔ میرا جواب سن کر اس نے کہا مَیں اپنے یہی الفاظ کاغذ پر لکھ دوں۔ چنانچہ مَیں نے یہ الفاظ کاغذ پر لکھ دیے۔ ڈی ایس پی نے یہ عبارت پڑھی تو غصے سے پاگل ہوگیا۔ اُس نے قلم زور سے زمین پر مارا اور کاغذ پھاڑ دیا۔ پھر مجھے مارنے کے لیے کرسی سے اُچھلا، مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی میں کرسی کا تکیہ ہی پکڑ سکا، لیکن اس پر اللہ کے فضل سے ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مجھے کچھ کہے بغیر دفتر سے باہر چلا گیا۔ پھر ایک سپاہی آیا اور اس نے مجھے قلعے کے دروازے کے پاس حوالات میں لے جاکر بند کردیا۔ اس روز دوپہر کو مجھے نہ تو کھانا دیا گیا اور نہ ہی پانی مل سکا۔ ظہر اور عصر کی نماز مَیں نے تیمم سے ادا کی، مغرب کے وقت مجھے وضو کے لیے پانی دے دیا گیا اور پھر مجھے کھانا بھی دیا گیا جس میں خلافِ معمول پھل بھی تھے۔ تقریباً نو بجے مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بڑے کمرے میں لایا گیا۔

یہاں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مجھے سیدھا کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی نے میرے بازو پکڑ کر اوپر کردیے اور ٹانگیں چوڑی کرنے کو کہا۔ اسی عالم میں دو تین گھنٹے گزر گئے، پھر وہ سپاہی چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرا آ گیا۔ اسی طرح تین تین گھنٹے کے بعد ڈیوٹیاں بدلتی رہیں۔ جونہی مَیں ہاتھ ذرا نیچے کرتا ڈیوٹی پر موجود سپاہی فوراً میرا بازو پکڑ کر ہاتھ اوپر کردیتا۔ یہ اذیت ناک سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ فجر سے دو گھنٹے قبل میرے پیٹ اور سینے میں شدید درد اُٹھا اور مَیں کراہنے لگا۔ لیکن ان لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر مَیں نے تہجد کے نفل ادا کرنے کی اجازت مانگی، لیکن اس سے بھی انکار کردیا گیا۔ درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے مَیں نے دُرود شریف کا ورد شروع کردیا۔ چند ہی لمحے بعد کافی افاقہ ہوگیا۔ نمازِ فجر ادا کرنے کی اجازت بھی مجھے نہ مل سکی۔ رات کے نو بجے سے صبح گیارہ بجے تک یہی عالم رہا، طبیعت نہایت مضمحل تھی اور تھکاوٹ سے بدن چور چور ہو رہا تھا۔ مَیں نے سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استغاثہ کیا اور یہ اشعار پڑھنے شروع کیے:

غوثِ اعظم بمن بے سروساماں مددے ☆ قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور مجھے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں لے گیا۔ یہاں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگادی گئی کہ وہ مجھے سونے نہ دے۔ پانی کا گھڑا تو لاکر رکھ دیا گیا مگر کھانا نہ ملا۔ نمازِ ظہر کے بعد میں نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ اقدس کی طرف رخ کیا اور اس شعر کا ورد شروع کردیا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا ☆ ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

عصر کے بعد وہ سپاہی چلا گیا اور میری آنکھ لگ گئی، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں سبز رنگ کی روشنی ہے، اس کمرے کی سیڑھیاں ہیں جس پر والد محترم حضرت علامہ ابوالحسنات (جو اس وقت سکھر جیل میں تھے) کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ انہوں نے سینے سے لگالیا، مَیں نے ان سے پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا، مجھے بھی انہوں نے رات بھر کھڑا رکھا ہے۔ اس گفتگو کے بعد مَیں اُن سیڑھیوں سے نیچے کمرے میں اترا تو مَیں نے دیکھا کہ شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو کہ کھلا ہوا ہے۔ میں اس کمرے میں دوزانو بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک بزرگ سپید نورانی چہرہ، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، سفید داڑھی، کھلی آستینوں کا سبز کرتہ زیب تن کیے میری طرف تشریف لائے اور پیچھے سے ایک آواز آئی ''سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لا رہے ہیں'' مَیں نے دست بستہ حضرت سے عرض کی، حضور ان کتوں نے بہت تنگ کررکھا ہے۔ سرکار غوث اعظم نے میری داہنی طرف پشت پر تھپکی دی اور فرمایا شاباش بیٹا گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مَیں نے دوبارہ عرض کی حضور! انہوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ رُخِ انور پر مسلسل شگفتگی تھی فرمایا، کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ اور یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے

گئے۔ اس واقعہ کے بعد میرا حوصلہ بہت بلند ہوگیا ورنہ اس رات کی اذیت سے ممکن تھا کہ میں ڈگمگا جاتا، لیکن سرکار غوث پاک کے روحانی کرم نے مجھے ذہنی اور قلبی سکون سے مالا مال کردیا۔ مغرب کے بعد مجھے کھانا دیا گیا اور پھر رات کو کسی نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ دوسرے روز اعلیٰ فوجی افسر راؤنڈ کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ مَیں نے انہیں تمام واقعات بتائے اور انہوں نے میرے سامنے متعلقہ پولیس افسران کی سرزنش کی اور کچھ ہدایات جاری کیں۔ پھر مجھے ایک دوسری حوالات میں منتقل کردیا گیا جو قدرے بہتر تھی۔ وہاں مَیں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی آواز سنی۔ مولانا تلاوتِ کلام پاک فرمارہے تھے۔ مَیں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قریبی حوالات میں ہیں۔ دوپہر کے وقت مجھے ایک بارک میں منتقل کردیا گیا جہاں بالکل سامنے مولانا عبدالستار خاں نیازی تھے۔ مولانا نیازی نے اشارے سے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ فاصلہ چونکہ خاصا تھا اس لیے مزید کوئی بات نہ ہوسکی، پھر سی آئی اے کے ایک افسر اعجاز حسین (جو کہ میرے واقف کار تھے اور چوک نواب صاحب میں رہتے تھے) میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے ایک چادر اور کچھ کپڑے دیے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کپڑے میرے تایا حافظ غلام احمد نے بھیجے ہیں۔ اس سے پہلے میرے کپڑے بہت زیادہ پھٹ چکے تھے اور بنیان میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے تایا حافظ صاحب سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کپڑے بھی وہ اپنی ذمہ داری پر لے آئے ہیں ورنہ اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ مغرب کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مَیں نے سربسجود ہوکر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی شاہ جی! یہ لے لو، اور پھر ایک لفافہ مجھے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی۔ مَیں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا، لیکن میرے دل کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ غیبی دعوت قاسمِ عالم ﷺ کے صدقے میں ملی ہے۔ وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک مَیں استعمال کرتا رہا۔

۱۰/اپریل کو تقریباً گیارہ بجے مجھے چارج شیٹ دی گئی۔ میرے خلاف ۲۹ مختلف دفعات کے تحت مقدمات قائم کیے گئے تھے، ان میں قتل وغارت اور فوج میں بدامنی پیدا کرنے کے مقدمات بھی شامل تھے۔ دوپہر ایک بجے کے قریب مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا اور بوسٹل جیل کے قریب ایک فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ فوجی عدالت میں کیپٹن شفیق نے پولیس افسر سے پوچھا کہ ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے؟ پولیس افسر نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے حکم دیا کہ ہتھکڑی کھول دی

جائے۔ چنانچہ عدالت ہی میں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مختصر سی عدالتی کاروائی کے بعد مجھے سنٹرل جیل (شادمان کالونی) پہنچا دیا گیا۔

سنٹرل جیل میں پہنچا تو وہاں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ بارکوں کے باہر ہزاروں افراد کا اجتماع تھا، بارکوں میں جگہ ختم ہو جانے کے باعث خاردار تار لگا کر شمع رسالت کے پروانوں کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ جیل کے مختلف حصوں میں عجیب کیف و سرور کی محفلیں برپا تھیں۔ کہیں نعت خوانی ہو رہی ہے تو کہیں ختم نبوت کے موضوع پر تقاریر، کہیں درود و سلام پڑھا جا رہا ہے تو کہیں ذکر و اذکار کا غلغلہ ہے، غرض ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔

مجھے سی کلاس کی ایک بارک میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھا گیا۔ دوسرے روز میں نے دیکھا کہ جیل کے گیٹ سے قطار کی صورت میں کچھ لوگ آرہے ہیں، جنہوں نے کندھوں پر بستر اُٹھا رکھے تھے، میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان میں میاں طفیل محمد، مولانا کوثر نیازی، مولانا امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خاں عزیز، نقی علی اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن ہیں۔ ان حضرات سے میں نے پوچھا حضرت! آپ کیسے تشریف لائے؟ جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رہنما نے جواب دیا، ہم تو گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمیں پکڑ کر لے آئے ہیں۔ میں نے کہا آپ کا جرم کیا ہے؟ وہ بولے جرم کا خود ہمیں بھی علم نہیں......، ان حضرات کو بھی مختلف بارکوں میں جگہ دی گئی۔

جیل کے اندر ہی کچھ فوجی عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور جو لوگ یہ تحریر لکھ دیتے تھے کہ ان کا تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ان کی رہائی فوراً عمل میں آجاتی تھی۔ باوجودیکہ کافی لوگ اس طرح رہا ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن جیل کی رونق اور ہماہمی میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ تیسرے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی کو بھی قلعے سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مولانا مودودی کو بھی گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ ان دونوں حضرات کو اے کلاس دے دی گئی اور ملاقات پر پابندی عائد کر دی گئی۔ میرے ساتھ سی کلاس میں اندرون دہلی دروازہ چنگڑ گلی کے نتھا پہلوان اور یکی دروازہ کے چند نامی گرامی غنڈوں کو رکھا گیا تھا۔ ایک روز مجھے جیل میں علم ہوا کہ میرے چچا زاد بھائی علامہ سید محمود احمد رضوی (جو کہ بعد میں مجلس عمل تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کے مرکزی جنرل سیکرٹری بنے) کو بھی گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے۔ میں نے مہر محمد حیات ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سے مطالبہ کیا کہ انہیں میرے ساتھ رکھا جائے۔ انہوں نے فوراً یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ محمود رضوی صاحب مجھے دیکھتے ہی بغلگیر ہو گئے اور میں نے ان کی خیریت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سائیکلو اسٹائل کے ذریعے جو ہدایات پورے شہر میں پہنچائی جاتی تھیں وہ ان کے قلم سے ہی لکھی جاتی تھیں اور ان کی گرفتاری اسی بنا پر عمل میں آئی ہے۔

محمود صاحب سے تحریک کی صورت حال اور گھر کی خیریت کا علم ہوا۔ ہمیں بم کیس کی بارکوں میں رکھا گیا تھا۔ ہماری قریبی بارکوں میں مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیۃ علماے پاکستان (مغربی پاکستان) بھی تھے، اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انہی بارکوں میں ایک نو سالہ بچہ خالد بھی تھا جس کے خلاف بغاوت، ڈاکہ اور آتش زنی وغیرہ سنگین نوعیت کے مقدمات بنائے گئے تھے، آٹھ روز بعد فوجی عدالت نے اسے رہا کردیا۔

مجھے ابھی تک اپنے والد محترم کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ اور نہ ہی میرے متعلق انہیں کوئی علم تھا، البتہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کراچی جیل میں انہیں میرے قتل کی اطلاع دی گئی تھی۔ اور سید عطا اللہ شاہ بخاری اور سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ چند روز تک تو ہم نے یہ خبر علامہ ابوالحسنات سے چھپائے رکھی اور پھر آخر کار ایک روز ہم نے انہیں بتا ہی دیا کہ آپ کے صاحبزادے کو موت کی نیند سلادیا گیا ہے۔ علامہ ابوالحسنات یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور انہوں نے فرمایا، میرے آقا گنبدِ خضرا کے مکیں ﷺ کو میرے اکلوتے بیٹے خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بارگاہِ ربی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔ ناموسِ رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اسوۂ شبیری پر عمل کرتے ہوئے سب کو قربان کردوں۔ اس کے بعد انہوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر کا آغاز کردیا۔ بعد میں والد صاحب کو سکھر جیل منتقل کردیا گیا تھا، اور خود ان کا بیان ہے کہ جیل میں جب بھی مجھے تمہاری یاد آئی تو میں قرآن پاک کی تفسیر شروع کردیا کرتا تھا اور اس سے دل کو تسکین ہوجاتی تھی۔ چنانچہ جیل میں انہوں نے نصف قرآن کی تفسیر مکمل کی اور باقی رہائی کے بعد تحریر فرمائی۔

چارج شیٹ میں فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل کا الزام مجھ پر اور مولانا عبدالستار خاں نیازی پر عاید کیا گیا تھا، اور اس کی تفصیل یہ بتائی گئی تھی کہ مسجد وزیر خاں میں مولانا عبدالستار خاں نیازی جلسۂ عام سے خطاب کررہے تھے اور صدارت میں کررہا تھا۔ فردوس شاہ ڈی ایس پی پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا ہی تھا کہ مولانا نیازی نے کہا ان کتوں کو مسجد سے نکالو، میں نے صدارت کی کرسی سے کہا جانے نہ پائیں، یہیں ختم کردو۔ یہ سُن کر نتھا پہلوان اور تقریباً نو دیگر افراد فردوس شاہ پر پل پڑے اور اسے وہیں قتل کردیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسجد میں نہ تو کوئی جلسہ ہورہا تھا اور نہ تقریر، بلکہ ایک جلوس چوہٹہ بستی بھگت سے نکلا، فردوس شاہ ایک سپاہی کے تحفظ کے لیے آرہا تھا کہ قتل کردیا گیا۔

میرے خلاف مقدمۂ قتل ایک فوجی عدالت میں چلایا گیا جو کہ سنٹرل جیل اور بوسٹل جیل کے درمیان لگائی گئی تھی۔ یہ مقدمہ تقریباً ۱۹ روز تک فوجی عدالت میں زیرِ سماعت رہا، حکومت کی طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے وہ جرح کے دوران پسینے سے شرابور ہوجاتے اور ان کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میری طرف سے چودھری نذیر احمد (سابق اٹارنی جنرل)، میاں غیاث الدین،

رفیق احمد باجوہ، چوہدری کلیم الدین اور چند دیگر وکلا فوجی عدالت میں پیش ہوئے۔ چوہدری نذیر احمد جب گواہوں پر جرح کرتے تو گواہوں کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ ایک گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ فردوس شاہ کی لاش مسجد وزیر خاں کے دروازے پر پڑی تھی اور مَیں اس کو اُٹھا کر چوک وزیر خاں میں لے آیا اور پھر مَیں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس نے ایک شیشی میں جائے وقوعہ سے لی گئی خون آلود مٹی بھی عدالت میں پیش کی۔ فوجی عدالت نے جو کہ ایک بریگیڈیر اور دو کرنلوں پر مشتمل تھی، مجھ سے مسجد وزیر خاں میں جمعہ کا وقت پوچھا جو مَیں نے بتادیا اور پھر عدالت نے کہا کہ وہ خود اگلے روز دس بجے صبح جائے وقوعہ کا معائنہ کرے گی۔

چنانچہ اگلے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی اور مَیں، فوجی عدالت اور چند دیگر افراد کے ہمراہ مسجد وزیر خاں میں آئے۔ ہمیں دیکھ کر مکانوں کی چھتوں اور مکانوں سے محبانِ تاجدارِ ختم نبوت نعرے لگانے لگے اور فوجی عدالت نے اپنی آنکھوں سے ملت اسلامیہ کے جذبات کا مشاہدہ کیا۔ جب عدالت جائے وقوعہ پر پہنچی تو وہاں پر گواہ کے بیان کے بالکل برعکس مٹی کے بجائے سنگِ سرخ کی سیڑھیاں تھیں۔ ۱۹ روز کی عدالتی کاروائی کے بعد عدالت نے ہمیں مقدمۂ قتل سے بری کردیا۔

بَری ہونے کے بعد ہم جیل سے سامان لینے کے لیے گئے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے اور مولانا نیازی کو کہا کہ آپ جلدی سے گھر ہو آئیں کیوں کہ دوبارہ گرفتاری کا خدشہ ہے۔ چنانچہ ہم سامان لیے بغیر ہی جیل سے چلے آئے۔ گھر پہنچ کر مَیں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے اور پھر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ اقدس پر پہنچ کر حاضری دی۔ واپسی پر دربار شریف کے باہر لوگوں نے گھیر لیا اور پھولوں کے ہار پہنائے۔ یہاں کئی دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی۔ مارشل لاء کی پابندیاں اگرچہ کافی نرم ہوچکی تھیں لیکن مارشل لاء کے اثرات ابھی بہت زیادہ باقی تھے۔ چوراہوں پر فوجیوں نے ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے ہوئے تھے۔ مَیں دربار شریف سے گھر جانے کے لیے تانگے پر بیٹھا، ابھی تانگہ لوہاری گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ پیچھے سے ایک فوجی جیپ آئی اس نے ہارن دیا اور رُکنے کا اشارہ کیا۔ ایک فوجی افسر نے میرے قریب آکر وارنٹ دکھائے اور کہا تشریف لے آیئے آپ کو دوبارہ گرفتار کیا جارہا ہے۔ مجھے چند گھنٹے تھانہ ٹکی گیٹ میں رکھنے کے بعد شاہی قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ اسی روز لوہاری دروازے کے کچھ افراد گرفتار ہوکر آئے تھے اور ان کے پاس گھر کا کھانا بھی موجود تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ مَیں نے بھی کھانا کھایا۔ ایک رات قلعے میں گزارنے کے بعد اگلے روز مجھے سنٹرل جیل پہنچادیا گیا۔ مولانا محمود احمد رضوی صاحب کو جیل سے ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں منتقل کردیا گیا تھا اور ملاقات پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک فوجی عدالت میں ۷، مارچ کو مسجد وزیر خاں میں ہونے والی میری تقریر کے خلاف

مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اس مقدمہ میں بھی میری پیروی ان وکلاء صاحبان نے ہی کی جو کہ مقدمۂ قتل میں پیش ہوئے تھے۔ اگرچہ سرکاری گواہیاں جرح کے دوران ساقط ہو چکی تھیں لیکن مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی اور مجھے جیل میں قیدیوں کا لباس پہنا دیا گیا۔ پہلے بان اور چرخے کی مشقت دی گئی۔ اسی دوران مولانا عبدالستار خاں نیازی (جنہیں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا تھا) اور مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی کو جس وقت سزائے موت سنائی گئی میں فوجی عدالت میں موجود تھا۔ انہوں نے سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد گرج کر کہا! بس... اس سے بھی زیادہ کوئی سزا آپ کے پاس ہے تو دے دیجیے، میں ناموسِ مصطفیٰ کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ مولانا نیازی نے اس موقع پر کچھ اشعار بھی پڑھے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سزائے موت کا فیصلہ سن کر انہیں ذرہ بھر افسوس بھی نہیں ہوا۔

مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمۂ بغاوت کی سماعت شروع کردی اور سرسری کارروائی کے بعد مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ فوجی عدالت کے سربراہ نے فیصلہ پڑھا ''ملزم کو گلے سے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ وہ مر نہ جائے''۔ سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن معاً بعد آیت کریمہ بل احیاء ولکن لا تشعرون زبان پر آ گئی اور پھر حوصلے کا یہ عالم تھا کہ جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے طبیعت مچلنے لگی اور جنت کے لہلہاتے ہوئے باغات آنکھوں میں گھومنے لگے۔ مجھے سزائے موت کے قیدیوں کے لیے مخصوص ''پکی کوٹھی'' میں لا کر بند کر دیا۔ میں اپنے بخت رسا پر ناز کرنے لگا کہ مقامِ مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

تین روز کے بعد مجھے دوبارہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری سزائے موت چودہ سال قید میں تبدیل کردی حالانکہ میں نے سزا میں تخفیف کے لیے کوئی اپیل نہ کی تھی۔ بعد میں مجھے علم ہوا میرے علاوہ مولانا نیازی اور مودودی صاحب کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف افغانستان کے ممتاز روحانی پیشوا ملا شور بازار (کابل)، حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی مدظلہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے اور دیگر اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے حکومت پاکستان کو تاریں اور قرار دادیں موصول ہونا شروع ہوگئی تھیں جن میں ہماری فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اندرون ملک بھی بڑا موثر ردِ عمل ہوا، دوسری طرف مرزائیوں کے سرخیل محمود بشیر کے لڑکے ناصر محمود کو رہا کردیا گیا۔ سر ظفر اللہ اس وقت وزیر خارجہ تھا اور تحریک کا ایک اہم مقصد مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹانا بھی تھا۔ ظفر اللہ نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر ناصر محمود کو رہا کروایا اور پاکستان کے طول و عرض میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے

ہماری سزائے موت کو ختم کرانے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ خان عبدالقیوم خان اس وقت وزیر داخلہ تھے، انہوں نے تحریک کو کچلنے کے لیے انتہائی تشدد آمیز رویہ اختیار کیا۔

میری سات سال اور چودہ سال کی سزائیں ایک ساتھ ہی شروع ہوگئی تھیں۔ مَیں بدستوری کلاس میں تھا جہاں گڑ اور چنے کا ناشتہ کرنا پڑتا تھا، دال روٹی کھانے کو ملتی تھی، دال نہایت عجیب اور بدمزہ ہوتی تھی اور مسلسل کھانے سے دل اکتا چکا تھا۔ پھر ایک قیدی قمرالدین نے مجھے سالن دینا شروع کردیا اور یوں گزارہ ہونے لگا۔ ایک روز مَیں نے سکھر جیل کے پتے پر والد محترم کو اپنی خیریت کا خط لکھا جس کا جواب مجھے پندرہ روز کے بعد موصول ہوگیا۔ والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تم رتبۂ شہادت حاصل نہیں کرسکے، لیکن بہرحال یہ جان کر دل کو اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفیٰ کی خاطر لڑ رہے ہو۔ خط کے آخر میں لکھا: ''کاش اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول کرلیتا''۔

چند روز بعد مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودی کی سزائے موت بھی چودہ سال قید بامشقت میں تبدیل ہوگئی اور انہیں اے کلاس کی بارکوں میں تبدیل کردیا گیا۔ مجھے بدستوری کلاس میں ہی رکھا گیا تھا۔ مَیں اکثر دوپہر کے وقت مشقت سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقات کے لیے ان کی بارک میں چلا جایا کرتا تھا۔ یہ دونوں حضرات زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ دوپہر کے وقت مولانا نصراللہ خاں عزیزؔ لطائف کی محفل جماتے۔ ایک روز دوپہر کے وقت میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، اُلٹیاں اور چکر آنے لگے۔ میں مولانا مودودی کی بارک میں داخل ہوا تو مولانا نے حسبِ معمول میری خیریت دریافت کی اور میری طبیعت ناساز پاکر انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا اور فوراً میری تیمارداری میں لگ گئے، انہوں نے جیل کے ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ پھر انہوں نے اپنی دواؤں میں سے مجھے دوا دی جس سے میری طبیعت قدرے سنبھل گئی، اس طرح ان کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا۔

نصراللہ خاں عزیز، سید نقی علی اور مودودی صاحب کے دیگر رفقا جیل میں اکثر مودودی صاحب کی تصنیفات تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے مجھے مولانا کا ایک کتابچہ ''تجدید احیائے دین'' پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے اسے بغور پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں اولیا کرام کی تنقیص کی گئی ہے اور بزرگانِ دین سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس میں اور بھی کئی قابلِ اعتراض عبارات نظر سے گزریں۔ پھر ایک روز مجھے مودودی صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کا موقع ملا تو مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کتابچہ میں اولیا کرام کے وجود سے انکار کیا ہے اور ان سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا ہے، آپ یہ الفاظ لکھنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ''مجھے تو آج تک کوئی ولی نظر

نہیں آیا"۔ میں نے عرض کی اگر آپ کو کوئی ولی نظر نہیں آیا تو اس بات کی دلیل نہیں کہ دنیا میں کوئی ولی موجود ہی نہیں، اور پھر آپ نے تو کسی نبی یا رسول کو بھی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ بھی تو کبھی آپ کو نظر نہیں آیا۔ چنانچہ اگر آپ کا وضع کردہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو پھر خدا اور رسول کے وجود سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔ یہ باتیں سن کر مودودی صاحب نے کہا یہ کتابچہ میں نے اس زمانے میں تحریر کیا تھا جب میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور انسان سے غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا آپ کی اس غلطی سے جو لوگ گمراہ ہوئے ہوں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ مولانا نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرلی اور میں نے انہیں کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اولیا اللہ کرام کی شان میں واضح طور پر فرمایا ہے الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولاھم یحزنون اور اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں اولیا کرام کے متعلق بہت سی آیات موجود ہیں، لہٰذا آپ کے اس کتابچہ کی اصلاح ہونی چاہیے۔ مودودی صاحب کچھ جواب دینا چاہتے تھے لیکن اسی اثنا میں ان کے کچھ رفقا آگئے اور بات دوسری طرف چل نکلی۔ اس کے بعد بھی ان سے کئی بار نہایت خوش گوار ماحول میں گفتگو کا موقع ملتا رہا۔

ایک روز جیل میں یہ اطلاع ملی کہ کچھ قیدیوں نے جیلر کی توہین کی ہے اور اس جرم کی پاداش میں انہیں ٹکٹکی لگائی جائے گی۔ ہم اپنی بارک سے اس مقام کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں پانچ چھ افراد کو نہایت بے دردی سے بید لگائے گئے۔ ہم نے چھپ کر یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ملزموں کے جسم سے گوشت قیمے کی طرح کٹ کر فضا میں اُڑتا ہوا نظر آیا۔ اس دردناک واقعہ کی مکمل تفصیل ہم نے لکھ کر ممبرانِ اسمبلی کو ارسال کی اور صوبائی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ آئندہ جیل میں کسی ملزم کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا جائے گا۔

اسی دوران مولانا احمد علی لاہوری کو ملتان سے سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کردیا گیا، وہ کچھ علیل تھے اس لیے انہیں جیل کے ہسپتال میں داخل کردیا گیا اور پھر دو روز بعد معلوم ہوا کہ انہیں رہا کردیا گیا ہے۔ ان کی رہائی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی، چنانچہ اس سلسلے میں جیل میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ وہ معافی مانگ کر رہا ہوئے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں حکومت نے ایک انکوائری کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کے قیام سے دو روز قبل مجھے جیل میں بی کلاس دے دی گئی اور اب میرا قیام جیل کے اس حصے میں تھا جہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا مودودی اور نصر اللہ خاں عزیز وغیرہ تھے، انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد سکھر جیل میں نظر بند تمام راہنماؤں کو سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کردیا اور ان تمام حضرات کو سنٹرل جیل کے اس حصے میں رکھا گیا جسے دیوانی گھر کہا جاتا ہے۔ جب میں پہلی بار ان حضرات سے ملاقات کے لیے دیوانی گھر کے دروازے پر

پہنچا تو سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے ''شہید اعظم'' کہہ کر پکارا اور بغل گیر ہوگئے۔ چند قدم آگے بڑھا تو شیخ حسام الدین اور تاج الدین انصاری سے ملاقات ہوئی۔ مَیں نے اپنے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بڑ کے درخت کی طرف لے گئے جہاں میرے والد محترم ایک چارپائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے، پہلی نظر میں تو مَیں انہیں پہچان بھی نہ سکا کیونکہ وہ بہت کمزور ہوگئے تھے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہے تھے۔ والد محترم نے مجھے دیکھا تو اُٹھ کر سینے سے لگالیا۔ مَیں نے عرض کی آپ اتنے کمزور کیوں ہوگئے؟ والد محترم نے فرمایا سکھر جیل سنٹر جیل تھی، ۱۲۵ ڈگری گرمی تھی اور جس بارک میں ہمیں رکھا تھا اس کے اوپر لوہے کی چادریں تھیں، پانی بھی وقت کی پابندی کے ساتھ ملتا تھا، اکثر پسینے سے ہی غسل کرکے تفسیر کا کام شروع کردیتا تھا۔

قایدین کی آمد کے بعد جیل میں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل ہوگئی تھی۔ اکثر علما والد محترم سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، والد صاحب قبلہ جیل سے ملنے والے راشن سے مٹھائی وغیرہ تیار کرکے گیارھویں شریف کے ختم کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک روز مولانا غلام محمد ترنم (جنہیں دیوانی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ''بم کیس'' کی بارکوں میں رکھا گیا تھا) معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل کا ہاتھ پکڑ کر انہیں والد صاحب کے پاس لے آئے اور انہوں نے از راہِ مذاق فرمایا کہ آج اس وہابی کو گیارھویں شریف کا تبرک کھلانا ہے۔ مولانا اسماعیل ہنستے ہوئے گیارھویں شریف کی محفل میں بیٹھ گئے۔ ان کے علاوہ عطاء اللہ شاہ بخاری اور کئی دیگر دیوبندی اور وہابی علما بھی اس محفل میں شریک تھے سوائے مولانا محمد علی جالندھری (ملتان) کے جو بدعت، بدعت کی گردان کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے جاتے تھے، اور تبرک لینے سے بھی انکار کرتے تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب نے فاتحہ خوانی میں شرکت کرنے کے بعد کہا کہ اگر یہی گیارھویں شریف ہے تو آپ میرے گھر روزانہ آئیے اور گیارھویں شریف کی فاتحہ کیجیے۔ پھر انہوں نے تبرک بھی کھایا اور اس کے بعد وہ اکثر والد صاحب سے علمی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ایک روز گیارھویں شریف کی محفل میں مودودی صاحب بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تبرک بھی کھایا۔ اس دوران ان کی والد صاحب سے چند علمی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی۔ شام کو مَیں مودودی صاحب سے ان کی بارک میں ملا تو وہ مجھے کہنے لگے، مولانا ابوالحسنات سے ملاقات کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور اُن کے تبحر علمی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ مَیں اپنا لٹریچر اُن کے سپرد کردوں تاکہ وہ اس کی اصلاح کردیں۔ مَیں نے مودودی صاحب سے کہا کہ اگر ایسا ہوجائے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

دوسرے روز مَیں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو مَیں نے مودودی صاحب سے گزشتہ روز کی گفتگو کا ذکر کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے کہا یہ سب منافقت ہے

مودودی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اس موقع پر مودودی صاحب کے خلاف اور بھی بہت سخت الفاظ استعمال کیے اور پھر جیل میں ان کے ورکروں نے مودودی صاحب کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی۔ جیل سے باہر مولانا احمد علی لاہوری نے مودودی صاحب کے خلاف اپنی مہم تیز تر کردی اور روزنامہ ''نوائے پاکستان'' کے ذریعے پروپیگنڈے کا اچھا خاصہ محاذ قائم کرلیا، لیکن مَیں بدستور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہا تاکہ مودودی صاحب سے اس کی اصلاح کروائی جاسکے۔

پھر جسٹس منیر (لاہور ہائی کورٹ) انکوائری کمیشن نے تحریکِ ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کردی۔ عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوس ناک اور خلاف توقع تھا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس پر حافظ خادم حسین، مولانا غلام محمد ترنم اور حضرت والد محترم نے سخت جرح فرمائی۔ مودودی صاحب تو یہاں تک کہہ گئے کہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کیے تھے، لیکن والد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس وہ دستاویز اب بھی موجود ہے جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر آپ نے دستخط کیے تھے۔ یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا ہاں مَیں نے چھوٹے سے دستخط کیے تھے۔ والد صاحب نے فرمایا تو کیا ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہیے تھا۔ مودودی صاحب لاجواب ہوگئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کردی جس پر ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا۔ مودودی صاحب کے علاوہ کسی راہنما نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کیے تھے۔

بہرحال میں پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر تھا لیکن ان کی اس صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ انکوائری کا سلسلہ جاری رہا لیکن چونکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کمیشن بٹھایا گیا تھا اس لیے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہ آیا۔ چنانچہ ممتاز صحافی مرتضےٰ احمد خاں میکش نے اپنی کتاب ''محاسبہ'' میں اس کمیشن کی کارکردگی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور تمام پہلوؤں کو واضح کیا۔

انکوائری کے دوران ایک روز والد محترم دیوانی گھر میں تشریف فرما تھے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، سید مظفر علی شمسی اور کچھ دیگر حضرات بھی ان کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری نے والد صاحب سے کہا حضرت موسم بہار ہے اور مجھے موچی دروازے کی یاد ستا رہی ہے، ہمیں کسی طرح جیل سے باہر جانا چاہیے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا یہاں ہم ایک عظیم مشن کی تکمیل کے لیے آئے ہوئے ہیں اور پھر مَیں تو کلام پاک کی تفسیر میں بھی مصروف ہوں باہر جاکر ہم لوگ نہ جانے کن مصروفیات میں اُلجھ جائیں۔ آیئے بارگاہِ الٰہی میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے اس مقدس مقصد کو پورا فرمائے، جس کی

خاطر ہم جیل آئے ہیں۔ سب نے آمین کہی اور پھر والد صاحب نے دعا فرمائی۔ الٰہی! اپنے حبیب کریم کے صدقے اس جیل کے قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے متمتع فرما، اس جیل کی دیواروں کو گرادے اور یہاں باغ و بہار بنادے۔ سب نے اس دعا پر بھی آمین کہی۔ یہ کچھ ایسی مقبول ساعت تھی کہ آج اس دعا کا ایک ایک لفظ مقبول و منظور ہوکر ہمارے سامنے آرہا ہے۔ وہی سنٹرل جیل آج شادمان کالونی میں تبدیل ہوچکی ہے، اس کی اونچی اونچی دیواریں گرچکی ہیں اور جیل کی بارکیں اب باغ و بہار کا نقشہ پیش کررہی ہیں۔

شادمان کالونی کے مشرقی حصے میں وہ بڑ کا درخت اب بھی موجود ہے جس کے نیچے یہ دعا کی گئی تھی اور جس کے نیچے بیٹھ کر والد صاحب تفسیر لکھا کرتے تھے۔ تقریباً ایک سال بعد ہائی کورٹ نے کراچی میں گرفتار ہونے والے تمام رہنماؤں کو رہا کردیا، لیکن مولانا نیازی، مولانا مودودی اور مجھے رہا نہیں کیا گیا تھا۔

ایک طویل عرصے تک جیل میں رہنے سے تقریباً سبھی حضرات ذیابیطس کے مریض ہوگئے تھے۔ ادھر عوام کے دلوں میں تحریک کے جذبات ابھی تک موجود تھے لیکن جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور بے انتہا تشدد کرکے تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر روا نہ رکھی گئی تھی۔ ہمارے علاوہ تحریک کے دیگر بہت سے رضا کار بھی ابھی تک جیلوں میں تھے۔ جیل سے رہا ہونے والے زعما نے اپنے مطالبات کے احیا کے لیے دہلی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کیا، اس جلسہ کی صدارت قبلہ والد صاحب نے کی، اور مختلف راہنماؤں نے اس جلسہ سے خطاب کیا اور تحریک کے حامیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد (جون ۱۹۵۵ء) میں ایک روز میں نماز عصر کے بعد بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک جیل کے ایک آفیسر نے آکر کہا کہ آپ کی رہائی کے آرڈر آئے ہیں، میرے لیے یہ بات خلافِ توقع تھی اور پہلے میں نے اسے مذاق ہی سمجھا لیکن پھر جیل کے آفیسر نے چلنے کو کہا تو مولانا نیازی اور مولانا مودودی نے مجھے مبارک باد دی۔ میری رہائی کے تقریباً چھ سات ماہ بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی کو بھی رہا کردیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مودودی صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے دیگر معززین شہر کے علاوہ مجھے بھی مدعو کیا، میں نے اس موقع پر مودودی صاحب سے کہا اب حالات معمول پر آچکے ہیں اپنا وعدہ پورا کیجیے اور اپنا سارا لٹریچر مجھے دیجیے تاکہ والد صاحب سے اس کی اصلاح کروا دوں۔ لیکن مولانا مودودی نے ٹالنے کی کوشش کی، میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے جیل میں میرا ارادہ تو بنا تھا لیکن اب جو چیز چھپ چکی ہے اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔

(بشکریہ، ماہنامہ ''فیضان'' فیصل آباد شمارہ اگست ۱۹۷۸ء، شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہند یاترا

علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی

اللہ کریم جل شانہ کے حبیب کریم ﷺ کے ذکر مبارک کی محفلیں دنیا بھر میں اہل ایمان منعقد کرتے ہیں اور ان محافل میں خوب رونق ہوتی ہے۔ جناب محمد شاہد اقبال قادری نوجوان ہیں، ان کا تعلق جنوبی ہند کے صوبہ آندھرا پردیش کے مرکزی شہر "حیدر آباد دکن" سے ہے۔ حیدر آباد، انڈیا کا پانچواں اور دنیا کا 41 واں بڑا میٹرو پولی ٹن ایریا (Metropolitan) شمار ہوتا ہے۔ سکندر آباد اس کے جڑواں شہر کی حیثیت سے برطانوی راج میں قائم ہوا۔ ان دونوں شہروں کو "حسین ساگر" (تالاب) جدا کرتا ہے۔ اسے اب "ٹینک بند" کہا جاتا ہے، اسے ابراہیم قطب شاہ نے 1562ء میں بنایا۔ حیدر آباد کو تاریخی، ثقافتی اور خاص طرزِ تعمیر کے لحاظ سے نمائندہ اور ہند کے شمال و جنوب ملنے کا مقام کہا جاتا ہے۔ جغرافیائی اور ثقافتی طور پر یہ زبانوں کی کثرت کا خطہ ہے۔ تیل گو (Telugu) بولی میں یہاں کی اُردو کی خاصی آمیزش ہے اور یہاں کی اُردو دیگر علاقوں سے منفرد لہجہ رکھتی ہے۔ اس میں مراٹھی الفاظ بھی ہیں، اس خاص لہجے کو حیدر آبادی ہندی بھی کہا جاتا ہے۔ بھارت کے ترقی یافتہ شہروں میں سے حیدر آباد ایک ہے۔ حیدر آباد کے مرکز میں "چار مینار" محمد قلی قطب شاہ نے 1591ء میں تعمیر کیے۔ قطب شاہی دور 1590ء میں موسی ندی، گول کنڈا قلعے تک آب رسانی کے لیے تھی۔ کہتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ ایک بن جارن لڑکی بھاگ متی کی محبت میں مبتلا ہوگیا، اسی وجہ سے اس علاقے کو اس نے بھاگیا نگر کا نام دیا۔ بھاگ متی کے مسلمان ہونے پر اسے "حیدر محل" خطاب ملا اور اس شہر کو "حیدر آباد" کا نام دیا گیا۔ یہ تیلنگانا (Telangana) کا خطہ ہے۔ دکن پلیٹو 541 میٹر سطح آب سے بلند ہے اور 260 کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ درجۂ حرارت یہاں 25 سے 40 Celsius (سیل سی اَس) کے درمیان رہتا ہے۔ یہاں کی مٹی سرخ و سیاہ ہے۔ چٹانی سرزمین ہے۔ موسم میں خشکی اور نمی رہتی ہے۔ یہاں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق آبادی چھتیس لاکھ بتیس ہزار چورانوے (3632094) تھی۔ اب کل آبادی 81 لاکھ ہے۔ مسلمان، ہندو اور کچھ عیسائی یہاں کی آبادی میں نمایاں ہیں۔ مضافات سے یہاں محنت مزدوری کے لیے آنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں جنہیں بن جارا کہتے ہیں۔ یہ "گر بولی" بولتے ہیں۔ یہ زبان خانہ بدوش یورپی لوگوں کی روما جیسی ہے۔ تیل گو، اردو اور دکنی یہاں کی مقامی زبانیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی میں یہاں موریَن حکمران تھے۔ 1321ء میں محمد بن تغلق کی فوجیں آئیں۔ بہمنی سلاطین کے قبضے کے بعد تیلنگانا میں گول کنڈا قلعہ مرکز رہا۔ 1518ء میں بہمنی سلطنت سے گول کنڈا سلطنت میں منتقل ہوا اور سلطان قلی قطب شاہ سے قطب شاہی دور شروع ہوا۔ سات قطب شاہی سلاطین عمدہ معمار شمار ہوئے۔ انہی کے دور میں یہاں مسلم تعلیم و ثقافت کو فروغ ملا۔ گول کنڈا کا علاقہ اس دور میں ہیروں، موتیوں، لوہے، اسلحے اور خوش نما پارچہ جات کے

حوالے سے دنیا میں مشہور ہوا۔ یہاں باغات، یہاں کے ماحول اور موسم کے اعتبار سے کام یاب رہے۔ اسے ایران کے شہر اصفہان کی طرح خوب صورتی میں بھی شہرت ملی۔ سترھویں صدی میں مغل شہزادے حضرت اورنگ زیب عالم گیر (رحمۃ اللہ علیہ) کا زیادہ وقت دکن ہی میں گزرا۔ مراٹھا قوتیں جو "شیوا" کے ماتحت تھیں مغلوں کو للکارتی رہیں۔ حضرت شاہ جہاں کی وفات 1666ء کے بعد اورنگ زیب کے فوجی کیمپ زیادہ تر دکن ہی میں رہے۔ یہاں فتح میدان جسے اب لال بہادر اسٹیڈیم بنادیا گیا ہے، 1687ء میں اورنگ زیب کی لشکر گاہ تھی۔ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا ذکر بھی اس دور میں اہم ہے۔ 1707ء میں حضرت اورنگ زیب کی وفات کے بعد حیدر آباد میں 1724ء میں آصف جاہ اوّل کو نظام الملک کا خطاب مغل حکمران کی طرف سے دیا گیا اور یہاں آصف جاہی دور شروع ہوا جو انگریز کی حکمرانی سے آزادی تک رہا۔ ان سات آصف جاہی "نظاموں" کے ادوار میں حیدر آباد کی ایک طرح سے تعمیر نو ہوئی اور معاشی و ثقافتی اعتبار سے یہ شہر پھر نمایاں ہوا۔ نظام ساگر، عثمان ساگر، حمایت ساگر وغیرہ اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ حیدر آباد ان کے دور میں ایک بڑی شاہی سلطنت تھا۔ یہاں کا اپنا سکہ تھا، ریلوے اور ڈاک کا اپنا نظام تھا اور کوئی ٹیکس نافذ نہیں تھا۔ برطانوی راج میں بھی نظام کو 21 توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ 1937ء میں ساتویں نظام میر عثمان علی خان اپنے عہد میں دنیا کے امیر ترین شخص شمار ہوتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ 400 کیرٹ وزن کا ہیرا پے پر ویٹ (Paper-weight: کاغذ داب) کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میر عثمان علی خان نظام دکن نے عثمانیہ جنرل ہسپتال اور عثمانیہ یونی ورسٹی جیسی عمارتیں بنائیں۔ یہ دور امن و آشتی اور خوش حالی میں مثالی بتایا جاتا ہے۔ یہ تمام تفصیل وکی پیڈیا، فری ان سائکلو پیڈیا، انٹرنیٹ سے لی گئی ہے۔ انٹرنیٹ کے مطابق حیدر آباد میں ان اولیاے کرام کے مزارات ہیں۔ حضرت سید یوسفین چشتی، حضرت سید شریفین چشتی، حضرت سید بابا شرف الدین سہروردی، حضرت سید مسکین شاہ بابا، حضرت سید خواجہ حسین شاہ ولی (انہی کے نام پر حسین ساگر ہے)، حضرت سید محی الدین پیراں، حضرت سید برہان الدین اولیا، حضرت سید اُجالے شاہ، حضرت سید جلال شاہ چشتی، حضرت سید جلال شاہ قادری، حضرت سید چراغ شاہ بابا، حضرت سید نذر محبوب علی شاہ قادری، حضرت سید عبداللہ شاہ قادری، حضرت شاہ خاموش اور حضرت سید محمد یحیٰ حسینی رحمۃ اللہ تعالی علیہم۔

آندھرا پردیش ٹورزم کے تعارفی پمفلٹ کے مطابق حیدر آباد میں 180 فٹ بلند چار مینار، گول کنڈا قلعہ، قطب شاہی گنبد، سالار جنگ میوزیم، مکہ مسجد، پائے گاہ گنبد، پرانی حویلی، برلا مندر، راموجی فلم سٹی، ہائی ٹیک سٹی، نہرو زولوجی کل پارک، بوٹنی کل گارڈن، این ٹی آر گارڈن، لم بی نی پارک، اندرا پارک، کے بی آر نیشنل پارک، پبلک گارڈن، آئی میکس تھیٹر، اسنو ورلڈ، حسین ساگر، شاہ میر پیٹ، حمایت ساگر، تارامتی بارہ دری، اوشین پارک، گاندھی پیٹ، میر عالم ٹینک، عثمان ساگر وغیرہ قابل دید مقامات ہیں۔ حیدر آباد کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد گلف اور امریکا میں ملازمت کرتی ہے۔ یہاں اردو کے چار روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ بھارت کا مشہور "ETV" چینل بھی اردو میں یہیں سے جاری ہوا ہے۔

شاہد اقبال صاحب کے بارہ بھائی ہیں اور ان میں سے بھی کچھ بیرونِ ملک ملازمت کرتے ہیں۔ شاہد صاحب گزشتہ گیارہ برس سے حیدر آباد میں مسلکِ حق اہلِ سنّت و جماعت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کل ہند رحمت عالم کمیٹی کے زیرِ اہتمام محافل کے انعقاد کا تسلسل رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ 125 علماے اہلِ سنّت کو مدعو کر چکے ہیں جن کے مواعظ و خطبات سے ساکنانِ حیدر آباد مستفید ہوئے ہیں۔ گزشتہ چار برس سے وہ ایک سالانہ پروگرام بعنوان "عظمتِ مصطفیٰ (ﷺ) کانفرنس" منعقد کر رہے ہیں اور اس سال فروری 2007ء میں وہ مجھے اس کانفرنس میں کلیدی خطاب کے لیے مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت سے رابطہ کرنے والے لوگوں کو ذاتی طور پر نہ جانتا ہوں تو انہیں ممبئی میں مقیم تحریک فکرِ رضا کے سربراہ جناب محمد زبیر قادری سے متعارف کرواتا ہوں۔ محمد زبیر صاحب قادری اپنے نام اور کام سے اہلِ سنّت میں خاصے جانے پہچانے ہیں، بھارت میں خطاب کرنے کے لیے مَیں نے پہلا سفر بھی اُن کی دعوت پر کیا تھا۔ شاہد اقبال صاحب کے لیے محمد زبیر قادری نے کچھ تحفظات بتائے اور ان کا حل بھی تجویز کیا۔ اس دوران رودولی شریف مدعو کرنے کے لیے حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب صدیقی نے بھی مسلسل رابطہ رکھا۔ عیدالاضحیٰ کے بعد ویزا کے لیے مَیں نے پاس پورٹ اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمیشن کو بھجوادیا۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھے خاصی تاخیر سے ویزا جاری کیا گیا۔ 17 فروری 2007ء کی دوپہر پی آئی اے کی پرواز PK274 سے ممبئی کے لیے روانگی ہوئی۔ طیارے میں جناب وسیم الاسلام ہم سفر تھے، وہ ممبئی میں پی آئی اے کے اسٹیشن مینیجر ہیں۔ ان کے چہرے پر داڑھی کی بہار سے خوشی ہوئی۔ گزشتہ سفر نامے میں ان سے ممبئی ایرپورٹ پر مختصر ملاقات کا تذکرہ مَیں نے کیا تھا۔ کراچی میں وہ اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات اور تعطیلات کے بعد واپس ممبئی جا رہے تھے۔ طیارے میں اڑان سے قبل کچھ افراد کی نشست تبدیل کی گئی۔ وسیم صاحب نے بتایا کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ٹیک آف یعنی فضا میں بلند ہونے کے لیے خالی طیارے میں وزن کا ایک تناسب ضروری ہے۔ آج طیارے میں متعدد نشستیں خالی تھیں اور مسافروں کی تمام تعداد ایک ہی حصے میں تھی اس لیے کچھ مسافروں کو جہاز کے وسط میں اور کچھ کو پیچھے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ یہ اہتمام صرف ٹیک آف کے لیے تھا اس کے بعد وہ نشستیں تبدیل کر سکتے تھے۔ کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ مسافر ایسے موقع پر طیارے کے عملے سے الجھ پڑتے ہیں اور نشست کی تبدیلی پر بہت برہم ہوتے ہیں، تاہم عملے کو چاہیے کہ وہ تکنیکی ضرورت واضح کر دے تاکہ مسافر تعاون کریں۔ جہاز میں عملے کے کسی نیر پرسر نے مجھے اور وسیم صاحب کو ہماری نشستوں ہی پر بیٹھے رہنے دیا۔ ممبئی ایرپورٹ کے بارے میں وسیم الاسلام صاحب نے بتایا کہ 675 طیاروں کی آمد و رفت یہاں سے روزانہ ہوتی ہے اور اس کے لاؤنج گزشتہ ایک برس میں خاصے بہتر بنا دیے گئے ہیں۔ البتہ دو "رن وے" یہاں کراس کی شکل میں بنائے گئے ہیں، ان کی اس ہیئت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بتا رہے تھے کہ ممبئی ایرپورٹ جب بھی مکمل نیا بنے گا تو بھارت کے تمام ایرپورٹس سے عمدہ ہوگا۔

گزشتہ سفر میں پی آئی اے کے عملے نے پاکستانی مسافروں کی امی گریشن کے لیے وہ فارم بھی طیارے

ہی میں ہمیں دے دیے تھے جو آج لاؤنج میں پہنچنے کے بعد فراہم کیے گئے۔ وسیم صاحب نے اس کی وجہ بھی بتائی کہ یہ سرکاری اسٹیشنری ہے اور اس کا ضیاع بہت ہوتا تھا۔ مسافروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے امیگریشن کے مراحل میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وسیم صاحب کے تعاون سے مجھے بہت آسانی رہی۔ محمد زبیر قادری اپنے ساتھیوں سمیت استقبال کو آئے۔ آتے ہی انہوں نے مجھے موبائل فون کی سم دے دی تاکہ مجھے آسانی رہے۔ ابھی سواری میں نہیں بیٹھے تھے کہ دعوت اسلامی ممبئی کے نگراں کا فون آیا۔ انہوں نے حضرت خوش تر نورانی سے بھی بات کروائی، وہ ممبئی آئے ہوئے تھے۔ حیدر آباد دکن کے حاجی سیٹھ صاحب، کیو ٹی وی کے سربراہ حاجی عبدالرؤف یعقوب کی دعوت پر کراچی آئے تھے۔ وہ بھی ملے اور حیدر آباد میری روانگی کا سن کر خوش ہوئے۔ زبیر صاحب مجھے لیے دوسرے ٹرمنل پر آگئے۔ ان کا کہنا تھا کہ طعام کے لیے شہر گئے تو ٹریفک کے ازدحام میں کہیں پھنس نہ جائیں۔ اس ٹرمنل پر آکر سامان میں سے وہ کتب جو زبیر میاں کو دینی تھیں، سامان سے نکالیں۔ نعت رنگ 19 کے کچھ شمارے اور فکرِ فاروقی ان کے لیے بطور خاص لایا تھا۔ زبیر میاں حیدر آباد تک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو انہوں نے سامان دیا اور ہم ایرپورٹ کی اندرونی عمارت میں آگئے۔ حیدرآباد تک پرواز کا دورانیہ تو ایک گھنٹا بیس منٹ تھا مگر روانگی میں ابھی خاصا وقت تھا۔ ممبئی میں کسی جگہ جائیے ہجوم ہی ملتا ہے۔ یہاں نوجوانوں پر مغربیت کا غلبہ ہو چکا ہے۔ شرم وحیا کم ہی رہ گئی ہے۔ ٹی وی اور فلمی دنیا کی یہاں یلغار ہی کچھ اور ہے۔ جانے کیا طلسم ہے کہ بھارت میں ٹورسٹ (سیاح) بہت آتے ہیں۔ تاریخی مقامات اور سیرگاہیں زیادہ تر مسلمانوں کی یادگاریں ہیں۔ آبادی، رقبہ، تجارت اور کئی اعتبار سے یہ ایک بڑا ملک ہے مگر اس کی معاشرت بہت بدل گئی ہے۔ زبیر میاں سے باتیں کرتا رہا اور وقت گزر گیا۔ سات بجے شام انڈین ایرلائنز کی پرواز 619 سے روانہ ہوکر حیدر آباد دکن پہنچے۔ یہاں ایک ہجوم استقبال کو موجود تھا۔ نعروں کی گونج میں شاہد اقبال صاحب نے پھولوں کے ہار پہنائے اور موٹر سائکلوں، کاروں کے جلوس میں ہمیں سکندر آباد لے گئے۔ کراچی سے حیدر آباد دکن پہنچنے میں مجھے بارہ گھنٹے سے زائد ہوگئے تھے۔ حیدر آباد کے جڑواں شہر سکندر آباد کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ہمیں پہنچایا گیا۔ یہاں پہنچتے ہی پہلا دھچکا جناب آصف قادری اور ان کے رفقا سے مل کر لگا۔ ان کے سروں پر تو سبز عمامے سجے ہوئے تھے لیکن انہوں نے سیاہ صافے حمائل کیے ہوئے تھے اور بتایا کہ وہ دعوتِ اسلامی سے الگ ہوکر ''تحریک اسلامی'' کے نام سے اپنی تنظیم بنا چکے ہیں۔ شاہد اقبال صاحب طعام کا کوئی اہتمام نہیں کر سکے تھے۔ کسی طعام گاہ سے کھانا منگوایا تھا، اس دوران لوگ آتے رہے اور ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ لوگ تو حیدر آبادی وضع آج بھی اپنائے ہوئے ہیں، مخصوص طرز کا پاجامہ، شیروانی اور ٹوپی ہر موسم میں ان کا لباس ہے۔ نوجوان نسل میں یہ وضع کم ہی میں نے دیکھی۔ گفتگو میں لہجہ البتہ حیدر آبادی صاف پہچانا جاتا ہے۔ ''پرسوں'' کا لفظ برسوں پرانی بات کے لیے بھی بولتے ہیں اور انگریزی لفظ کی جمع بھی اپنی بولی میں بولتے ہیں۔ جلسہ گاہ قریب ہی تھی۔ بتایا گیا کہ گیارہ بج کر بیس منٹ پر میرا خطاب شروع ہوجائے گا۔ جلسہ گاہ میں لے جایا گیا۔ یہ ایک مزار شریف سے ملحق گراؤنڈ تھا اسے کارخانہ

بازار کا لالہ شاہ گراؤنڈ کہا جاتا ہے۔ علما و مشائخ وہاں تشریف فرما تھے۔ ان میں صدر نشین ہستی جامعہ عثمانیہ کے حضرت علامہ محمد عبداللہ قریشی ازہری تھے۔ ان کے ساتھ رحمت عالم کمیٹی کے سرپرست کے برادر محترم حضرت سید شاہ محمد حسینی بغدادی قادری کی نشست تھی۔ حیدر آباد ہی کے مشہور خطیب مولانا مفتی محمد نعیم الدین نعیمی کا بیان دیر تک جاری رہا۔ ان کے بعد جناب محمد نعیم اختر قادری اپنا کلام اپنی مترنم آواز میں سنا کر داد پاتے رہے۔ مَیں سوچتا رہا کہ اتنی تاخیر کیوں کی جارہی ہے؟ جو وقت میرے خطاب کا بتایا گیا تھا اسے ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا، سفر کی تھکان بھی کم نہیں تھی، وہ لوگ جو مجھے ٹی وی چینلز پر دیکھتے رہے تھے خاصی تعداد میں جمع تھے، انہیں بھی اتنا انتظار کروانا کیوں ضروری سمجھا گیا؟ حیدر آباد دکن میں جلسۂ عام سے میرا پہلا خطاب تھا۔ مجھے فکر تھی کہ تھکان کا اثر آواز پر ہوگیا تو لوگ مایوس نہ ہوجائیں۔ بالآخر منتظمین کو مجھ پر ترس آ ہی گیا۔ اللہ کریم کا نام لے کر گفتگو شروع کی۔ ڈیڑھ گھنٹا بیان ہوا، سامعین نے توجہ سے سنا اور بحمدہٖ تعالیٰ بہت پسند کیا۔

محمد ہارون صاحب خاصا عرصہ دبئی گزار چکے ہیں۔ وہ گیسٹ ہاؤس لائے، ہجوم میں سے بھی بہت سے لوگ گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ میلاد کمیٹی کے جناب اقبال قادری، جناب ادریس قادری اور ان کے ساتھی بھی تشریف لائے اور بہت محبت سے ملے۔ زبیر قادری بہت تھک چکے تھے، وہ بھی چاہ رہے تھے کہ انہیں نیند کرنے کا موقع مل جائے۔ فجر کے بعد ہی ہم کچھ دیر نیند کرسکے۔ اگلے روز محمد ہارون صاحب نے ظہرانے کا اہتمام اپنی قیام گاہ پر کیا تھا۔ ان کے والد محترم اس علاقے کی معمر شخصیت ہیں، ترانوے (93) برس کی عمر میں بھی چاق چوبند ہیں۔ اس ظہرانے کے بعد محمد زبیر قادری ممبئی کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ یہاں سے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچادیا گیا۔ مجھے ایک دکان میں لے جایا گیا۔ اس دکان پر ''پان محل'' درج تھا۔ دکان دار نے پانوں کی فہرست میرے سامنے رکھ دی، اس میں پانوں کے پچاس نام درج تھے اور دس روپے سے تین سو اسی روپے تک کی قیمتیں لکھی تھیں۔ چھوٹے سے خوش نما بکس میں پان کی گلوری رکھ کر بکس پر اسٹکر چسپاں کیا جاتا ہے۔ اس اسٹکر پر پان کی قسم درج ہوتی ہے۔ مجھے لال کرتی، راول پنڈی کی مشہور دکان ''دار السرور'' یاد آئی۔ مَیں نے پان محل سے ایک سادہ پان لے لیا۔ یہاں سے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچادیا گیا۔

منتظمین کو مَیں بتاچکا تھا کہ حیدر آباد میں مجھے دائرۃ المعارف، آصفیہ لائبریری، جامعہ عثمانیہ، سالار جنگ میوزیم، گول کنڈا قلعہ اور اہم یادگاروں کو دیکھنا ہے۔ حکیم سید احمد حسین امجد حیدر آبادی کی تمام کتب مجھے مطلوب ہیں۔ کُل ہند رحمت عالم کمیٹی کے ایک خاص رکن ہدایت اللہ خان ارشد کم سنی میں پولیو کی وجہ سے ٹانگوں سے کچھ معذور رہ گئے تھے، انہیں اس معذوری کے باوجود دینی سرگرمیوں میں بہت دل چسپی ہے، وہ اور ان کے بھائی ولی اللہ خان اور دوسرے ساتھی میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ مغرب کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شیخ الفقہ اور تحریک اسلامی کے تین ذمہ داران آئے، ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ شاہد اقبال صاحب نے بتایا کہ عشائیہ میں جانا ہے۔ سکندر آباد سے حیدر آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حسین ساگر، جنرل پوسٹ آفس نظر آیا جس پر اردو میں ''صدر ٹپا خانہ'' بھی درج تھا۔ معظم جاہی مارکٹ آئی، یہاں اب بھی نظام دکن کے عہد کا طریق

رائج ہے، اسی عہد کے مطابق دکانوں کا معمولی کرایہ لیا جاتا ہے لیکن نیلام کے ذریعہ منظوری ہوتی ہے۔ پتھر گٹی کے علاقے میں ہر عمارت پتھر کی ہے۔ برلب سڑک ایک مسجد کی چھت پر غیر مسلم کمپنی کا بورڈ آویزاں دیکھا۔ مجھے ایک سندھی کی ''کراچی بیکری'' بھی دکھائی گئی۔ موسیٰ ندی اب گندا نالہ ہو کے رہ گئی ہے۔ اس پر بنے پل سے گزرے تو بائیں جانب سالار جنگ میوزیم کی خوش نما عمارت نظر آئی۔ دائیں جانب ہائی کورٹ بھی ایک تاریخی عمارت میں واقع ہے وہ عمارت بھی پُرشکوہ نظر آئی۔ مدینہ ہوٹل کے نام سے قائم عمارت کے بارے میں بتایا گیا کہ نظام دکن نے یہ عمارت حرمین شریفین کے اخراجات میں تعاون کے لیے بنائی تھی، اس کی تمام آمدنی وہاں بھجوائی جاتی تھی۔ ''چار مینار'' حیدر آباد میں اہم عمارت ہے۔ کھچا کھچ بھرے رہنے والے اس علاقے میں صفائی ستھرائی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ مکّہ مسجد یہاں بڑی اور تاریخی مسجد ہے۔ اس کے بالمقابل نظام دکن کا قائم کیا ہوا ''دواخانہ'' ہے جو آج بھی جاری ہے۔ چوڑی بازار سے گزر کر دیوانِ عالی پہنچے۔ یہاں اقبال قادری صاحب (میلاد کمیٹی والے) نے استقبال کیا اور حکیم سجاد صاحب سے متعارف کروایا، ان کی دختر کی نسبت طے ہونے کی خوشی میں یہ تقریب تھی جس میں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں پُر تکلف ضیافت کے بعد میلاد کمیٹی کے وابستگان نے عزت افزائی کرتے ہوئے مجھے شال اوڑھائی اور ہار پہنائے۔ گیسٹ ہاؤس واپس آتے ہوئے نام پلی کے علاقے سے گزرے، حیدر آباد کا ریلوے اسٹیشن آج بھی مشہور ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں پہنچے ہی تھے کہ جدّہ سے سید نورالحسن شاہ صاحب کا فون آیا۔ وہ حیدر آباد ہی کے باشندے ہیں، انہیں قلق تھا کہ وہ حیدر آباد میں میری مہمانی کو موجود نہیں۔ شاہد اقبال صاحب کو وہ جانے کیا کیا ہدایات دیتے رہے۔ رحمت عالم کمیٹی کے سرپرست کا شکاگو سے فون آیا۔ حیدر آباد میری آمد پر اظہار تشکر کرتے ہوئے وہ یہاں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ امریکا کے شہر شکاگو میں حیدر آباد دکن کے باشندے خاصی تعداد میں ہیں۔ 1996ء میں ان لوگوں سے ملنا ہوا تھا۔ گزشتہ برس سین ڈی آ گو (امریکا) میں حیدر آباد کے وابستگان مجھے غلام فاروق رحمانی صاحب کے ہاں ملے تھے۔ شاہد اقبال صاحب بتا رہے تھے کہ رحمت عالم کمیٹی کے سرپرست، حضرت سیدنا غوث پاک رضی اللّٰہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں اور اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری علیہ الرحمہ سے بہت محبت رکھتے ہیں اور عمدہ خطاب کرتے ہیں۔ محترم حاجی عبدالمجید نوری اور الحاج فاروق درویش سے ٹیلے فون پر بات ہوئی۔ ممبئی ٹھہرنا نہیں ہوا تھا اس لیے ان دوستوں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ان سے 28 فروری کو ممبئی میں ملاقات طے ہوئی۔ محترم الحاج محمد سعید نوری سے بھی فون پر بات ہوئی۔ شاہد اقبال صاحب سے گزشتہ روز عرض کی تھی کہ قیام گاہ بدل سکیں تو مہربانی ہوگی۔ انہوں نے آج کے لیے وعدہ کیا تھا اور اب وہ اگلے دن کا وعدہ کر رہے تھے۔ اگلے روز ٹھہرانے کا اہتمام ہدایت اللّٰہ خان ارشد نے اپنے گھر کیا تھا۔ شام کو رانی گنج کے علاقے میں ایک ہوٹل میں منتقل ہوئے۔ یہ دن بھی یونہی گزر گیا۔ مغرب کی نماز تاریخی مکّہ مسجد میں ادا کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد میں بیک وقت دس ہزار افراد کے نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ اس مسجد کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک نوجوان نے بتایا کہ اس مسجد کی دیواریں

اونچی نہیں ہو رہی تھیں، یہاں مکہ مکرمہ سے ایک پتھر لا کر لگایا گیا تو دیواریں ٹھہریں۔ اپنی دانست کے مطابق اس نے وہ پتھر بھی دکھایا۔ اس مسجد میں تین منبر ہیں۔ قبلہ سمت کھڑے ہوں تو مسجد کے صحن میں بائیں جانب کچھ قبریں پختہ اور عمدہ بنی ہوئی ہیں۔ دائیں طرف ایک کمرہ مقفل ہے، اس میں تبرکات محفوظ ہیں۔ غلافِ کعبہ کے قرآنی آیتوں والے ٹکڑے مسجد میں آویزاں ہیں۔ نماز کے بعد امام صاحب اپنی گاڑی میں واپس جا رہے تھے، مسجد کے دروازے پر ان سے ملاقات ہوئی۔ نام سن کر وہ گاڑی سے اترے اور محبت سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ قبور یہاں کے سلاطین کی ہیں۔ مسجد کے ساتھ والی گلی میں چوڑی بازار ہے۔ بتایا گیا کہ حیدر آباد دکن کی ساختہ چوڑیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں اور ایکس پورٹ (برآمد) ہوتی ہیں۔ یہاں رضوان قادری صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتایا کہ یہاں کے موتی بھی مشہور ہیں اور وہ انہی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اسٹوڈنٹس بک شاپ پر چاہا کہ کوئی کتاب حیدر آباد دکن کے حوالے سے مل جائے لیکن مایوسی ہوئی۔ یہاں ٹریفک کا عجب چلن ہے، کوئی راستہ نہیں دیتا، ہر ڈرائیور خود راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔ خواتین بھی اسکوٹر چلاتی ہیں اور ساڑھی میں ملبوس سر پر ہیلمٹ پہن کر چلاتی ہیں۔ ہوٹل واپس آئے۔ شاہد اقبال صاحب نے دن بھر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا وہ گیارہ بجے شب آئے۔ انہوں نے بتایا کہ جامعہ عثمانیہ میں کوئی نزاع طلبہ و اساتذہ کے درمیان ہو گیا ہے اس لیے وہاں جانے کا پروگرام نہیں بن سکا اور وہ خود 24 اور 25 فروری کے اجتماعات کی تیاریوں میں بہت مشغول ہیں اس لیے کوئی رابطہ نہیں کر سکے۔ ان سے کہا کہ اگر یونہی خالی دن گزرنے ہیں تو مجھے اجمیر شریف کا سفر کرنے دیں کیوں کہ 25 فروری کے بعد مجھے مہلت نہیں ملے گی۔ اگلے روز ہدایت اللہ خان ارشد مجھے پیراڈائز ریسٹورنٹ لے گئے۔ یہ وہاں کی مشہور طعام گاہ ہے۔ یہ دن بھی یونہی گزر گیا۔ شام کو بی جاپور کے سجادہ نشین سید تنویر میاں کا فون آیا، وہ فرما رہے تھے کہ حیدر آباد آ کر بی جاپور نہ آنا کیسی بات ہے؟ عرض کی کہ میں تو گل برگہ شریف بھی جانا چاہتا ہوں لیکن ویزا نہیں ہے اس لیے مجبور ہوں۔ وہ کہنے لگے میں انتظام کی کوشش کرتا ہوں۔ شام کو سید علیم الدین صاحب مجھے رانی گنج ہی میں واقع اپنی دکان پر لے گئے۔ یہاں فٹ پاتھ پر میں نے کئی جگہ قبریں دیکھیں۔ بتایا گیا کہ یہ پرانی قبریں ہیں اور مجاہدین کی ہیں اور ان قبروں کو اسی طرح قائم رکھا گیا ہے۔ رات کو شاہد اقبال صاحب اجمیر شریف کے سفر کے لیے اگلی صبح کی پرواز کا ٹکٹ لے آئے۔

اُجین کے مولانا محبوب عالم رضوی اور ان کے اہل خانہ سے فون پر بات ہوئی۔ وہ سب ملنے کے لیے آنے کو بے قرار تھے۔ باسنی سے مولانا غلام مصطفیٰ رضوی کا بھی فون آیا۔ بھارت میں ایر سہارا، جیٹ ایر، ایر دکن، انڈی گو ایر، گو ایر، اسپائس جیٹ، کنگ فشر ایر اور جانے کتنی پرائی ویٹ ایر لائنز ہیں۔ راجستھان کے شہر جے پور کے لیے براستہ احمد آباد (گجرات) اسپائس جیٹ کی پرواز سے علی الصبح روانہ ہوا۔ محترم الحاج راشد کاغذی جے پور ایرپورٹ پر میرے منتظر تھے۔ ان کے والد گرامی اور دو بھائیوں سے پہلے جے پور میں میری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کے والد محترم کراچی میں میرے والد گرامی علیہ الرحمہ سے مل چکے ہیں۔ یہ خاندانِ برکات، مارہرہ شریف سے وابستہ ہیں۔ راشد صاحب سے رابطوں کے باوجود یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کا

تعارف الحاج فاروق درویش صاحب نے کروایا تھا۔ اپنے والد گرامی علیہ الرحمہ اور اپنی تصانیف کا مکمل سیٹ انہیں پیش کیا۔ اپنے دفتر میں راشد صاحب نے عمدہ ناشتا کروایا اور مجھے اجمیر شریف بھجوایا۔ دوپہر ایک بجے کے قریب میں اجمیر شریف پہنچا۔ یہاں لوگ مجھے سرِ راہ ہی پہچان گئے۔ محترم سید عبدالمقدم صاحب تو لپک کر ملے اور ماہِ رمضان میں نبی پاک ﷺ کے نور ہونے کے حوالے سے مفتی محمد اکمل کے موقف سے میرے اختلاف کی فون کال پر مجھے بہت دعائیں اور مبارک باد دیتے رہے۔ محترم راشد کاغذی صاحب نے اجمیر شریف میں بھی اپنے احباب کو میری آمد سے باخبر کردیا تھا۔ عبدالعلیم صاحب میرے منتظر تھے۔ ظہر کی اذان ہوچکی تھی۔ غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگا اور سید فخر عالم صاحب مجھے درگاہ شریف لے گئے۔ راشد برکاتی صاحب نے بھی پھول پیش کرنے کو کہا تھا۔ پھول جب تک سوکھ نہیں جاتے، اللّٰہ کریم کی تسبیح کرتے ہیں، صاحبِ مزار بھی پھولوں کی تسبیح سے مانوس ہوتے ہیں۔ میں نے راشد صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور خود بھی سبھی اہلِ ایمان کی طرف سے پھولوں کی ڈالیاں لیں۔ خادمین اپنے پاس آنے والے زائرین کو خود زیارت کرواتے ہیں، گنبد شریف دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ ادب سے حاضری دی۔ نمازِ ظہر کے بعد کچھ دیر کے لیے حجرہ شریف میں آمد و رفت روک دی جاتی ہے اور صفائی کی جاتی ہے۔ مجھے میری گزارش پر احاطے ہی میں رہنے دیا گیا۔ نماز کے بعد مواجہ شریف میں بیٹھ کر بہت سکون سے دو گھنٹے قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہا۔ حجرہ شریف کھولے جانے کے بعد جناب سید عبدالمقدم نے پھر زیارت کروائی اور خوب دعائیں میرے لیے کیں۔ انہوں نے دستار بندی کروائی اور مزار شریف پر لگایا جانے والا صندل بھی بطور تبرک دیا۔ ایصالِ ثواب کے بعد میں نے خود بھی دعا کی۔ محترم سید عبدالمقدم صاحب مجھے حجرہ شریف ہی سے ملحق اس کمرے میں لے گئے جہاں ان کے جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ فخر الدین گردیزی کی قبر ہے اور ایک صندوق دکھایا جس پر چاندی کا پترا چڑھا تھا۔ ان کے مطابق اس میں قرآن کریم کا قلمی مخطوطہ ہے جس کی خطاطی کا انتساب انہوں نے حضرت سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللّٰہ عنہ سے بتایا۔ مور کے پروں کے تنکوں سے تیار وہ جھاڑو دکھائی جس سے صفائی کی جاتی ہے۔ حجرہ شریف کی چابیوں والا ڈورا میرے گلے میں ڈالا اور مزار شریف پر ہونے والی خدمات کی تفصیل بتائی۔ وہ خادمین کی تنظیم ''انجمن معینیہ فخریہ چشتیہ خدامِ خواجہ صاحب، سید زادگان (رجسٹرڈ) درگاہ شریف، اجمیر۔ انڈیا'' کے دفتر میں لے گئے۔ ان سے شرعی امور اور زائرین کے حوالے سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ انہوں نے دو کتابچے مجھے دیے۔ ان کتابچوں میں سے ایک کتابچہ خادمین سے متعلق ہے۔ اسے جناب سید عبدالفتاح مدنی نے مرتب کیا ہے۔ تاریخ طباعت 23 جون 1984ء درج ہے۔ اس کے مندرجات کے مطابق حضرات خواجہ فخر الدین گردیزی وہ ہستی ہیں جنہیں سلطان الہند حضرت سیدنا خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری سرکار غریب نواز رضی اللّٰہ عنہ کے خاص خادم ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ خواجہ گردیزی تیرھویں پشت میں مولائے کائنات خلیفہ رابع حضرت سیدنا علی المرتضی رضی اللّٰہ عنہ کی اولاد ہیں۔ کتابچے میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللّٰہ عنہ کے ساتھ ہی حضرت خواجہ عثمان ہرونی

رضی اللہ عنہ نے حضرت خواجہ فخر الدین گردیزی کو روانہ کیا اور ماہ محرم 856 ہجری میں ان بزرگوں کی اجمیر میں آمد ہوئی۔ بحکم مرشد خواجہ گردیزی نے تادمِ آخر حضرت سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللہ عنہ کی رفاقت و خدمت کو اپنا اعزاز جانا۔ خواجہ گردیزی کی اولاد "سید زادگان" کے نام سے موسوم ہوئی اور مغل اعظم کے عہد حکومت میں انہیں جاگیریں بھی دی گئیں تاکہ یہ سیدزادگان فکرِ معاش کی بجائے پوری توجہ سے درگاہ شریف میں خدمات انجام دیتے رہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اس تمام تفصیل کا باضابطہ رکارڈ محفوظ ہے۔ اس کتابچے کے مطابق حضرت سیدنا خواجہ غریب نواز رضی اللہ عنہ کے مزار شریف کی کلید برداری اور جملہ در و بست انہی سید زادگان کا حق ہے۔ یہ تمام سید زادگان آپس میں حقوق کے اعتبار سے برابر ہیں۔ ہر تین برس کے بعد انجمن کی مجلسِ انتظامیہ کے آزادانہ انتخابات اس انجمن کے بالغ رائے دہندگان کرتے ہیں۔ مجلس انتظامیہ کے ارکان کی تعداد 21 افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ مجلسِ انتظامیہ کے ارکان ہی مجلسِ عاملہ کے گیارہ ارکان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس کتابچے میں 21 اگست 1983ء میں منتخب ہونے والے ارکان انتظامیہ و عاملہ کی فہرست بھی شامل ہے۔

عصر سے پہلے سید فخر عالم صاحب نے لنگر میں بننے والا کھچڑا بھی کھلایا اور مختصر طعام کا اہتمام بھی کیا۔ عصر کی نماز ادا کر کے نائب ناظم عبدالعلیم صاحب اور سید عبدالمقدم صاحب کے ساتھ کچھ دیر نشست ہوئی۔ ٹی وی پر میرے خطابات اور انداز پر اپنی پسندیدگی کا وہ والہانہ اظہار کرتے رہے۔ ان احباب کی محبتوں پر ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے دعاؤں میں یاد رکھنے کی التماس کے بعد اجمیر شریف سے رخصت ہوا۔ محترم راشد برکاتی صاحب اپنے گھر میں دسترخوان سجائے میرے منتظر تھے۔ کھانے کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور نفاست پسند ہیں۔ محمد راشد صاحب برکاتی جس محلے میں رہتے ہیں اسے کاغذی برادری سے ہی انتساب ہے۔ راشد صاحب علمائے اہلِ سنّت کی تصانیف بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں اور دینی کاموں میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ وہ کبھی پاکستان نہیں آئے، اوراد و وظائف کی کثرت ان کا معمول ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ جے پور میں بھی میرا خطاب ہو۔ عرض کی کہ اجمیر شریف کے بہانے جے پور آنا ہوجاتا ہے یہاں کا ویزا نہیں ہے، ان شاء اللہ آئندہ سفر میں پروگرام بنائیں گے۔ دیر تک ان سے دینی گفتگو رہی۔ ان کے والد محترم نے کچھ احباب کو مدعو کرلیا تھا۔ اپنے مرشد گرامی سے وہ بہت عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی نوازشات کا ذکر بہت خوب کرتے ہیں۔ میرے والد گرامی علیہ الرحمہ سے اپنی ملاقات کا واقعہ پھر سنایا۔ اگلے روز راشد صاحب نے مجھے جے پور کی کچھ شاہراہیں دکھائیں اور ایرپورٹ پہنچایا۔ حیدر آباد دکن کا یہ سفر بھی براستہ احمد آباد تھا۔ طیارے کا یہ روٹ بہت لمبی مسافت کا تھا۔ حیدر آباد پہنچے تو شاہد اقبال صاحب ایرپورٹ پر استقبال کو موجود تھے۔ اپنے ساتھ وہ جناب محمد سعد اللہ حسینی کو لائے تھے اور بتایا کہ میرا حیدر آباد دکن میں 25 فروری تک قیام انہی کے ہاں ہوگا، جب کہ وہ فون پر بتاچکے تھے کہ ہوٹل میں کمرا لے لیا گیا ہے۔ شاہد صاحب ایرپورٹ ہی سے رخصت چاہ رہے تھے، ان سے عرض کی کہ وہ ساتھ آئیں۔ سعد اللہ صاحب نے بتایا کہ تقریباً تین گھنٹے سے یہاں ایرپورٹ آئے ہوئے ہیں انہیں پرواز کی آمد سے دو گھنٹے قبل طلب کرلیا گیا تھا۔ انڈسٹریل ایریا میں شہر سے خاصی دور انہوں نے حال ہی

میں نیا فلیٹ خریدا ہے۔ چار روز سے اس عمارت میں آب رسانی معطل تھی۔ شاہد صاحب نے بتایا کہ جناب سعد اللہ حسینی رحمت عالم کمیٹی کے ایک معاون جناب ڈاکٹر محمد عبدالنعیم کے ساڑھو (ہم زلف) ہیں۔ انہی کے کہنے پر سعد اللہ صاحب نے مجھے مہمان بنایا تھا۔ ان کے اہلِ خانہ نے بہت محبت وعقیدت سے پذیرائی کی۔ گھر میں عمدہ طعام کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد شاہد صاحب سے کہا کہ وہ جو کچھ مجھے کہتے ہیں اس کے برعکس کیوں کرتے ہیں؟ وہی بتائیں کہ یہاں ملنے کے لیے آنے والوں کو اور یہاں سے شہر جانے میں مجھے کس قدر وقت درکار ہوگا؟ شاہد صاحب ہی نے کہا تھا کہ 24 اور 25 فروری کے پروگرام حیدر آباد شہر کے پرانے علاقوں میں ہیں، یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت ہے۔ ٹریفک کے ازدحام میں دورانیہ زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔ ہر کوئی اس جگہ بآسانی آ بھی نہیں سکتا۔ صاحب خانہ بتا رہے ہیں کہ آب رسانی بھی معطل ہے۔ میری وجہ سے انہیں کس قدر تکلف کرنا پڑے گا۔ سعد اللہ صاحب کی اہلیہ محترمہ گیلانی سادات میں سے ہیں، مجھے گوارا نہیں کہ انہیں تکلیف دوں۔ شاہد صاحب نے کہا کہ وہ صبح نماز جمعہ سے قبل نام پلّی کے علاقے میں ہوٹل میں کمرا لے لیں گے۔ جناب سعد اللہ حسینی کے ساتھی منیر صاحب اور دیگر رات گئے تک گفتگو کرتے رہے۔ گھر والوں نے جانے کہاں سے پانی لا کے ٹب بھرے تھے۔ صبح بھی شاہد صاحب اپنا قول نہ نبھا سکے۔ یہاں مَیں نے احباب میں مرزا عبدالشکور بیگ مرحوم اور اسکول میں اپنے اردو کے معلّم جناب اقتدار احمد اکبر کا ذکر کیا، خیال تھا کہ شاید کوئی ان کا قرابت دار مل جائے۔ ان دونوں ہستیوں کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ مرزا صاحب سے مدینہ منورہ اور کراچی میں ملاقاتیں رہیں، وہ حضرت قطب مدینہ علیہ الرحمہ کے ہاں خاصے مقبول تھے۔ ان کی کہی ہوئی ایک منقبت ''احمد رضا کا تازہ گلستاں ہے آج بھی'' پہلی مرتبہ مدینہ منورہ ہی میں سُنی تھی۔

اعظم پورہ کی صحیفہ مسجد میں پہنچتے پہنچتے ہمیں ایک بج گیا، مسجد کے خطیب صاحب نے کہا کہ آج کچھ تاخیر سے نماز ادا کی جائے گی جب کہ مسجد کمیٹی کے صدر نے اعلان کیا کہ نماز وقتِ مقررہ پر ہوگی۔ مَیں نے اپنا خطاب دیے گئے وقت ہی میں پورا کیا اور وقت پر نماز پڑھائی۔ یہاں دیر تک لوگوں سے مصافحہ کا سلسلہ رہا۔ جناب موسیٰ ابو خالد نے تعارفی کارڈ دیا اور بتایا کہ وہ درود شریف کے حوالے سے کچھ کتب شائع اور تقسیم کرتے ہیں اور ملاقات چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ شاہد صاحب سے بات کرلیں۔ (موسیٰ ابو خالد صدیقی صاحب نے میری وطن واپسی کے بعد بھی مجھ سے رابطہ رکھا۔ قصیدۂ بردہ شریف مترجم اور گلدستۂ نعت کتب بھی بھجوائیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ نعت شریف اور درود وسلام کے حوالے سے بہت جذبہ اور ولولہ رکھتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ تقسیم سے قبل حیدر آباد ہی کے جناب محمد الیاس برنی نعت شریف کے مجموعے شائع کرتے تھے) صحیفہ مسجد کے خطیب صاحب کے حجرے میں کچھ نوجوان آئے اور بتایا کہ وہ میری تیار کی ہوئی وی سی ڈی (VCD) ''آخر اختلاف کیوں'' میں دکھائی گئی تمام کتب جمع کرچکے ہیں کیوں کہ کچھ لوگ بچشم خود کتابیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ حوالے وہ ان کتابوں کی نئی طباعت میں تلاش نہیں کرسکے۔ ان کی خواہش تھی کہ مَیں وہ حوالات ان کتب میں نشان زد کردوں۔ مَیں نے ان سے کتب لے لیں۔ ڈاکٹر عبدالنعیم صاحب سے بھی صحیفہ مسجد میں

ملاقات ہوئی اور خوشی ہوئی کہ رحمت عالم کمیٹی میں وہ پڑھے لکھے سنجیدہ شخص ہیں۔ مسجد سے ہمیں جناب احمد رضا کے یہاں لے جایا گیا۔ فارسی کے شعبے سے وابستہ جناب احمد رضا نے اپنے گھر میں طعام کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے حضرت علامہ محمد عبداللہ قریشی ازہری اور متعدد احباب سے یہاں عمدہ نشست رہی۔ بلاشبہ بہت عمدہ طعام تھا۔ حیدر آباد میں یہاں کی مشہور بریانی اور خوبانی کے میٹھے کی ڈش سعد اللہ حسینی کے گھر کے بعد جناب احمد رضا کے ہاں ہی اپنے صحیح ذائقے کے ساتھ کھانے کو ملی۔ طعام کے بعد کہا گیا کہ قریب ہی ایک مدرسہ ہے وہاں پانچ منٹ کے لیے جانا ہے۔ جس مسافت کو قریب کہا گیا تھا وہ 25 منٹ میں طے ہوئی، برلب سڑک چھوٹی سی مسجد سے ملحق مدرسے کی مختصر عمارت میں قرآنی تعلیم کا کام اچھا ہورہا ہے۔ ایک کم سن طالب علم نے نعت شریف سنائی۔ مہتمم مدرسہ مولانا نے تاثرات قلم بند کروائے۔ دعا کے بعد ہم وہاں سے نام پلی کے لیے روانہ ہوئے۔ سعد اللہ صاحب اپنے سب کام چھوڑ کر صبح سے ساتھ تھے۔ شاہد صاحب نے جس ہوٹل میں بلایا تھا یہاں پہنچ کر تمام کارروائی ہوئی۔ یہاں "المعهد الديني العربي" کے نوجوان فاضل مولانا آصف اپنے احباب کے ساتھ تشریف لائے اور اگلے روز ظہر کے وقت اپنے ادارے میں مجھے طلبہ و اساتذہ سے خطاب کے لیے عربی میں دعوت نامہ بھی لائے۔ شروع دنوں میں شاہد صاحب نے کسی سے رابطہ نہیں رکھا اب ہر لحہ مصروف گزرنے کا سماں تھا۔ ڈاکٹر نعیم صاحب ان سب کی سفارش کررہے تھے۔ مولانا آصف صاحب ٹی وی پر دیکھے ہوئے میرے پروگراموں اور والد گرامی قبلہ علیہ الرحمہ کی کتاب میں میری ایک تحریر کا بہت ذکر کرتے رہے۔ اپنی اور والد صاحب قبلہ کی تمام کتب کا ایک سیٹ ان کے ادارے کے لیے پیش کیا۔ سعد اللہ صاحب کو کہیں ضروری جانا تھا، ان کے بعد ڈاکٹر نعیم صاحب بھی چلے گئے۔ مخالفین کی کتب میں معترضہ عبارات نشان زد کرتا رہا۔ ہدایت اللہ ارشد بھی چلے گئے۔ سعد اللہ اپنے احباب سمیت رات گئے آگئے، کچھ دیر بعد وہ بھی تشریف لے گئے۔

اگلی صبح ممبئی سے محمد زبیر قادری صاحب تشریف لے آئے تھے۔ "المعهد الديني العربي" جس علاقے میں ہے اسے "خلوت" کہتے ہیں۔ نظام دکن کی یہاں رہائش گاہ کو اب سیر گاہ بنایا جارہا ہے۔ المعہد کے سربراہ اور جامعہ عثمانیہ کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا محمد خواجہ شریف نے استقبال کیا اور بہت عزت افزائی فرمائی۔ مدرسہ کی سہ منزلہ عمارت، کمرہ ہائے تدریس، دارالاقامہ اور دارالمطالعہ و کتب خانہ دکھایا، اساتذہ سے متعارف کروایا۔ یہاں ظہرانے کا بھی اہتمام تھا۔ حضرت شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ سے میرے استقبال کو کچھ دیر کے لیے تشریف لائے تھے۔ ظہرانے کے بعد وہاں درسِ حدیث کے لیے تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالنعیم صاحب نے حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار ڈاکٹر عباس متقی کو بھی یہاں مدعو کیا تھا، اُن سے مختصر مگر خوب گفتگو رہی۔ اس ادارے کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کم عرصے میں یہاں معیاری کام ہوا ہے۔ یہاں تمام اساتذہ نے متعدد کتب بھی شائع کی ہیں۔ ہر کمرے میں عمدہ خطاطی کے نمونے آویزاں تھے۔ بتایا گیا کہ یہ سب یہاں کے طلبہ کی محنت ہے۔ تھرموپول کی ایک بڑی شیٹ پر عربی نعت شریف کی خطاطی کو جس صفائی اور عمدگی سے کاٹ کر نمایاں کیا گیا ہے، دیکھنے والا داد دیے بغیر نہیں رہے گا۔ یہاں مختصر نشست ہوئی۔ عمدہ عربی لہجے میں تلاوت اور

عربی نعت شریف کے بعد مولانا آصف صاحب نے درسی کتب کے طلبا کے سامنے استقبالی کلمات کہے اور مجھے دعوتِ خطاب دی۔ المعہد کی مطبوعہ کتب کا سیٹ مجھے دیا گیا۔ یہاں سے ہمیں جامعہ عثمانیہ جانا تھا لیکن بتایا گیا کہ دائرۃ المعارف کل اتوار کو بند ہوگا اس لیے طے پایا کہ دائرۃ المعارف چلتے ہیں۔ ڈاکٹر نعیم صاحب پہلے ملے ہوتے تو مجھے حیدر آباد میں ان تمام جگہوں کو بآسانی دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ تقسیم سے قبل دائرۃ المعارف ہی وہ نمایاں ادارہ تھا جہاں سے اہم اسلامی کتب کی اشاعت ہوتی تھی۔ حیدر آباد کی یونی ورسٹی غالباً پندرہ سو ایکٹر رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ہزار کالج اس سے منسلک ہیں، دائرۃ المعارف کو اب وہ توجہ سرکاری طور پر میسر نہیں جو نظام دکن کے عہد میں حاصل تھی۔ اس عمارت میں آہنی حروف سے کم پوزنگ اور طباعت اب بھی جاری ہے۔ یہاں کی مطبوعہ کتب کی ایک فہرست دیکھی، مجھے بتایا گیا کہ یہ تمام کتب موجود نہیں ان میں سے جو ذخیرے میں موجود تھیں وہ دیکھیں اور کچھ کتب خرید لیں۔ زبیر قادری صاحب نے انہیں بذریعہ ڈاک ترسیل کا اپنا طریق بتایا۔ سعد اللہ حسینی بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سربراہ سے ملاقات کو گئے مگر اس لمحے یونی ورسٹی میں ہندو طلبا ایک مسلم استاد سے جس طرح اُلجھ رہے تھے وہ سانحہ شدید تھا۔ اس سانحے کے سبب ماحول ایسا نہیں رہا تھا کہ وہاں ٹھہرا جا سکے۔ شعبۂ فارسی کے سربراہ بھی پریشان تھے، ان سے لمحاتی ملاقات کے بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔ جامعہ عثمانیہ جانے کا وقت نہیں رہا تھا، ہم دربار یوسفین آگئے۔ عصر کی نماز ہم نے دائرۃ المعارف میں ادا کی تھی، مغرب یہاں درگاہ شریف کی مسجد میں ادا کی۔ حضرت اورنگ زیب عالم گیر علیہ الرحمہ کی فوج میں بطور مجاہد شامل دو بزرگوں کی درگاہ ''دربار یوسفین'' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر عبد النعیم صاحب نے زبانی تو بہت کچھ بتایا لیکن کوئی مطبوعہ تذکرہ مَیں حاصل نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر عبد النعیم صاحب یہاں حاضری سے قبل ہم سے رخصت ہوگئے تھے مگر پھر تشریف لے آئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کو ایک بات بتانی تھی اس لیے پھر چلا آیا، وہ یہ کہ مزار شریف کی پائنتی میں جو قبریں ہیں ان میں اردو کے مشہور شاعر حضرت داغؔ دہلوی اور ان کی اہلیہ بھی مدفون ہیں۔ انہوں نے مجھے وہ قبریں دکھائیں۔ وہاں بھی فاتحہ خوانی کی۔ مزار شریف پر حاضری کے بعد ہم ہوٹل پہنچے۔ سید نور الحسن شاہ صاحب نے جدّہ سے فون پر سعودی ایرلائن کے اسٹاف سے ملنے کی تاکید کی تھی۔ عبد الواحد صاحب کے ہم راہ مشتاق صاحب، پریم کمار اور نجے آئے۔ ان سب سے دیر تک دینی اخلاقی گفتگو ہوئی جسے باقی حاضرین نے زیادہ شوق سے سُنا۔ پریم کمار کو اولیا اللہ سے خاصی وابستگی ہے۔ اللہ کرے وہ نورِ اسلام سے مشرف ہو جائے۔ محمد سعد اللہ صاحب، منیر صاحب اور سب نے تجویز کیا کہ آج بہار ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔ کھانے سے ابھی واپس نہیں آئے تھے کہ شاہد اقبال صاحب کا فون آگیا کہ حضرت مولانا شاہد رضا نعیمی کا خطاب شروع ہو چکا ہے۔ آپ فوراً آجائیں۔ آج ''تاج دارِ مدینہ کانفرنس'' کے عنوان سے نزد درگاہ عنبر شاہ بابا، عنبر پیٹھ کے یم سی ایچ پلے گراؤنڈ میں اجتماع تھا۔ جلسہ گاہ پہنچے تو ہمارے پہنچنے کے بعد برطانیا سے تشریف لائے ہوئے حضرت مولانا شاہد رضا نعیمی کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ مَیں نہیں سمجھ سکا کہ شاہد صاحب نے کیوں غلط بیانی سے کام لیا۔ مولانا شاہد رضا صاحب نے

گھڑی دیکھ کر پورا ایک گھنٹا عمدہ خطاب کیا۔ ان کے فوراً بعد میرا خطاب شروع ہوا۔ سکندر آباد میں ہجوم سے مصافحہ نہیں کر سکا تھا آج تقریر کے بعد دیر تک مصافحہ کا سلسلہ رہا یہاں تک کہ مجھے گاڑی تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ سعد اللہ صاحب نے ہوٹل پہنچایا۔ اسٹیج پر زبیر قادری صاحب کو لوگ ماہِ میلاد میں مجھ سے وقت چاہنے کے لیے گھیرے رہے۔ جنوبی افریقا سے حضرت مولانا مفتی محمد اکبر ہزاروی اور اس کے علاوہ امریکا، برطانیا کے احباب کے بھی فون آتے رہے۔ فجر سے کچھ پہلے جناب شاہد اقبال اور ڈاکٹر عبدالنعیم صاحب آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے شاہد اقبال صاحب سے کہا کہ آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ آپ پر کس کس کا حق ہے؟ آپ کو دینی خدمات انجام دیتے ہوئے زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔ دین و مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے لیے آپ نوجوانوں کو ساتھ لے کر جو کام کر رہے ہیں اس میں نظم و ترتیب کے لیے ضروری ہے کہ آپ کام بانٹیں اور ساتھیوں کو بھی صلاحیتیں ظاہر کرنے کا موقع دیں۔ تمام کام آپ اپنے ہی ذمے رکھیں گے تو وعدہ خلافی اور غلط بیانی کا سلسلہ بڑھے گا جس سے مہمان غلط تاثر لیں گے اور آپ کی شہرت خراب ہوگی۔ وہ اگلے روز کے لیے پھر وعدے کر گئے۔ اتوار 25 فروری کو حیدر آباد کے اس سفر میں میرے قیام کا آخری دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ دو بجے دن جامعہ عثمانیہ جائیں گے لیکن تین بجے تک کوئی نہ آیا۔ دوپہر میں جناب محمد زبیر قادری ممبئی واپس روانہ ہو گئے۔

محمد سعد اللہ حسینی صاحب کے سسرال میں ظہرانہ تھا۔ وہاں پورا پری وار (خاندان) جمع تھا۔ سعد اللہ حسینی اور ڈاکٹر نعیم الدین صاحب کی بیویوں نے بہت عمدہ کھانے پکائے تھے۔ شیر خُرما بھی شاید حیدر آباد ہی کی ایجاد ہے۔ عیدالفطر کے موقع پر ہی بنایا جاتا ہے مگر آج میٹھے میں شیر خُرما تھا اور کیا خوب تھا۔ عصر کے بعد سعد اللہ صاحب ایک مزار شریف پر لے گئے۔ یہاں حاضری نہ ہوتی تو حیدر آباد کا سفر ادھورا ہی رہتا۔ گل برگہ نہ جا سکا تو حضرت سیدنا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کے نبیرہ (پوتے) ہی کی حاضری ہو گئی۔ ڈاکٹر نعیم صاحب نے بتایا کہ اس مزار شریف کا گنبد ایشیا میں بلند ترین ہے۔ وہاں مغرب کی نماز ادا کی تو خانقاہ کے مسند نشین میرے منتظر تھے۔ حضرت سیدنا شاہ راجو محمد، محمد الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی حضرت سید شاہ محمد یوسف محمد الحسینی ہے لیکن حضرت سید شاہ راجو الحسینی کی عرفیت ہی زبان زد عام ہے۔ مصری گنج، بیرون فتح دروازہ کے علاقے میں مزار شریف کے ساتھ خاصا رقبہ ہے۔ گنبد شریف بہت بلند ہے لیکن اس کی نگہ داشت برسوں سے نہیں ہوئی۔ مزار شریف کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ہر ستون ایک پتھر کا ہے۔ تقریباً بیس فٹ بلند ستون صرف ایک پتھر کا ہونا بھی انوکھی بات ہے۔ ان ستونوں پر بنی چھت بھی پتھر کی ہے اور ہر ایک سِل بھی ایک ہی پتھر کی ہے۔ طرز تعمیر عمدہ ہے لیکن وہی بات کہ مدت سے رنگ و روغن یا صفائی کا کوئی کام نہیں ہوا۔ مزار شریف پر حاضری کے بعد سجادہ نشین اپنے گھر لے گئے۔ یہاں محمد چاند خاں بھی ملے، ان کے پاس میرے تمام ٹی وی پروگرامز کی ریکارڈنگ محفوظ ہے۔ وہ کے بل نیٹ کے حوالے سے وہاں جانے پہچانے ہیں۔ موجودہ سجادہ نشین، صاحب مزار کے ہم نام ہیں۔ بہت محبت سے انہوں نے پذیرائی کی اور صاحب مزار کی تین تصانیف طریق الموحدین، کیمیائے ذات (منظوم) اور زادالموحدین (حصہ اوّل) عطا کیں۔ محترم سجادہ نشین نے ان رسائل میں اصل فارسی متن کا

التزام بھی رکھا ہے۔ عرس مبارک کا دعوت نامہ بھی دیا۔ 13، 14، 15 صفر المظفر کو سہ روزہ تقاریب ہوتی ہیں۔
شاہد اقبال صاحب نے مجھ سے تو کوئی رابطہ نہیں کیا، ڈاکٹر نعیم صاحب کو ہدایات دیتے رہے۔ میں ہوٹل واپس جانا چاہتا تھا مگر مجھے کہیں اور لے جایا گیا۔ دکن کے مشہور خطیب مولانا سید محمود صفی اللہ حسینی المعروف حضرت وقار پاشا کے ہاں پہنچے۔ یہ آستانہ حضرت محبوب اللہ کہلاتا ہے۔ مزار شریف پر فاتحہ کے بعد عشاء کی نماز ادا کی۔ حضرت مولانا شاہد رضا نعیمی بھی وہاں تشریف لے آئے۔ حضرت وقار پاشا بڑی محبت سے میرے والد گرامی علیہ الرحمہ کا ذکر کرتے رہے۔ ان کے بھائی اور دیگر مقربین ٹی وی کے پروگراموں اور حیدر آباد میں میری تقاریر کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے ہوٹل پہنچے۔ سعد اللہ صاحب دوپہر سے ساتھ تھے، وہ کھانے کے لیے ریسٹورنٹ لے گئے۔ شاہد اقبال صاحب کو فون کیا، انہوں نے آج بھی کوئی وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ اُن سے کہا کہ تین بجے شب دہلی کے لیے فلائٹ کا وقت ہے، آج میری تقریر پہلے کروائیں ورنہ مجھے دشواری ہوگی۔ سعد اللہ صاحب کے ہم راہ مغل پورہ کے گراؤنڈ میں پہنچے۔ عظمت اہلِ بیت اطہار کانفرنس کے عنوان سے اجتماع تھا۔ ناظم جلسہ کہہ رہے تھے کہ یہ انداز اور یہ خطاب مدتوں یاد رہیں گے۔ تقریباً دو گھنٹے میرا خطاب جاری رہا۔ خطاب کے دوران حضرت مولانا شاہد رضا نعیمی بھی تشریف لے آئے تھے، آج ان کا خطاب میرے بعد ہونا تھا۔ میں نے خطاب ختم کیا تو مجمع اُٹھ گیا، اسی ہجوم میں بمشکل راستہ بنا کر سعد اللہ صاحب مجھے ہوٹل لائے۔ سامان لے کر انہی کے ساتھ ہم ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ جمعرات کی شب سے واپسی تک سعد اللہ صاحب اور ان کے اہلِ خانہ نے جس عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا، اللہ کریم انہیں اس کی بے پناہ جزائے خیر عطا فرمائے۔
"اِس پائس جیٹ" کے طیارے سے دہلی روانہ ہوا۔ دو گھنٹے کی پرواز کے بعد صبح پونے چھ بجے دہلی پہنچا۔ یہاں خاصی خنکی تھی۔ بہت سی خوبیوں کے پے کر جنابِ خوش تر یعنی فاضل نوجوان، مولانا خوش تر نورانی کو آمد کی خبر تھی، ان سے کہا کہ علی الصبح انہیں دشواری ہوگی، صرف رہ نمائی فرمادیں لیکن وہ نہ صرف خود استقبال کو آئے بلکہ حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کو بھی ساتھ لائے اور جناب ابو الفیض معینی بھی نظر آئے۔ عرض کیا کہ "خامہ تلاشی" کے بعد کیا "جامہ تلاشی" ہوگی؟ مولانا اسید الحق کو دیکھ اور مل کر خوشی ہوئی۔ وہ حضرت مولانا فضل رسول قادری بدایونی علیہ الرحمہ کے نبیرۂ محترم ہیں۔ خوش شکل، خوش لباس، "بانکے" اور فاضل از ہر ہیں۔ بقول کسے "بہت نستعلیق" شخص ہیں۔ مجاہد ملت حضرت مولانا عبد الحامد بدایونی علیہ الرحمہ سے ان کی قرابت جان کر خوشی سوا ہوئی۔ مولانا خوش تر نورانی سے میرا ذکر سن کر وہ بھی نیند چھوڑ کر تشریف لائے تھے۔ ہوٹل پہنچنے تک "جام نور" کے تقلید و اجتہاد نمبر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا خوش تر نورانی فرما رہے تھے کہ انہیں میری تحریر کا انتظار ہے۔ انہیں کہا کہ شروع تو کی ہے لیکن مکمل نہیں کر سکا، کوشش کروں گا کہ آج کل ہی میں پوری کر دوں۔
ہوٹل پہنچ کر ان حضرات سے عرض کی کہ وہ آرام فرمائیں، شام کو ان سے پھر ملاقات ہوگی۔ مولانا خوش تر فرما رہے تھے کہ وہ دن بھر میرے ساتھ رہیں گے۔ عرض کی کہ دہلی میرا دیکھا بھالا ہے، آپ کو اتنا تنگ نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے شرمندگی ہو، شام کو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ حضرت پیر زادہ اقبال احمد فاروقی کے لکھے ہوئے

اداریوں پر مشتمل تازہ کتاب ''فکر فاروقی'' اور جناب سید صبیح الدین رحمانی کے نعت رنگ 19 کے دو شمارے انہیں پیش کیے اور والد محترم علیہ الرحمہ کی اور اپنی تصانیف کا مکمل سیٹ بھی دیا کہ وہ کسی اچھے جامعہ یا لائب ریری میں پہنچا دیں تا کہ زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔ دو گھنٹے قدرے استراحت کے بعد ہوٹل سے نکلا۔ دہلی میں صرف آج ہی کا دن قیام تھا، کل دوپہر مجھے لکھنؤ روانہ ہونا تھا۔ یہاں تمام درگاہوں پر حاضری، بازار میں شاپنگ اور ملاقاتوں کے لیے چند گھنٹے نہیں کچھ دن ہونے چاہئیں۔ بازار میں جناب غلام محمد اور محمد حنیف صاحب نے مجھے پہچان کر بہت پذیرائی کی۔ مجھے نقش بندی سلسلۂ تصوف کی ایک کتاب ''مصباح الحیات'' دی اور ٹی وی چینلز پر میری دینی خدمات کو بہت سراہا۔ اللہ کریم انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ عزیزوں دوستوں کے لیے کچھ تحائف خریدے۔ ٹریفک کے مسائل یہاں بھی کم نہیں۔ شام چھ بجے واپس ہوٹل آ گیا۔ مولانا خوش تر نورانی سے فون پر طے ہوا تھا کہ ساڑھے سات بجے شام درگاہ حضرت سیدنا محمد نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ میں ملاقات ہوگی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب شرر مصباحی بھی ملنا چاہتے ہیں، وہ بھی عشائیے میں ساتھ ہوں گے۔ آٹو رکشا کی بھارت میں بھرمار ہے مگر وہ کہیں بہت ہوتے ہیں اور کبھی وہ آپ کی منزل پر جانے کو راضی نہیں ہوتے۔ مجھے اس شام کچھ دشواری ہوئی، بالآخر ایک ڈرائیور مان گیا۔

برلب سڑک مولانا خوش تر نورانی اور مولانا اسید الحق کے ساتھ حضرت شرر مصباحی بھی میرے منتظر تھے۔ شرر صاحب سے پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔ مولانا اسید الحق کے ساتھ میں سلطان المشائخ سیدنا محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی مقدس خانقاہ میں حاضر ہوا۔ سیدنا ابوالحسن امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف پر حاضری کے بعد مولانا اسید الحق کی رہ نمائی میں حضرت سیدنا ابراہیم ایرجی علیہ الرحمہ کے مرقد پر سلام عرض کرنے کے بعد حضرت سیدنا محبوب الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو مزار شریف کے احاطے میں موجود سید زادگان نے پہچان لیا۔ وہ فوراً حجرے میں آئے اور قبر شریف سے ایک چادر مجھے عطا کی۔ فاتحہ و دعا کے بعد محترم سید فدا محمد نظامی اور ان کے ساتھیوں نے عزت افزائی کی۔ وہ کیو ٹی وی کے حوالے سے اپنی شکایات مجھے کچھ اس طرح سنا رہے تھے جیسے میرا تعلق اس کی انتظامیہ سے ہو۔ ان کا یہ شکوہ تھا کہ میں کیو ٹی وی پر اب کیوں نہیں نظر آتا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم بہت آسان اور اچھے انداز میں عقاید سکھاتے تھے۔ یہاں تمہاری گفتگو سے ہزاروں کی اصلاح ہوئی، خانہ دار خواتین تمہیں کتنی دعائیں دیتی ہیں، تمہیں اندازہ نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہاں تو کوئی دینی مذہبی ٹی وی چینل نہیں ہے۔ کیو ٹی وی کی وجہ سے لوگ خوش ہوتے ہیں مگر وہ یہاں تسلسل سے نہیں آتا۔ کیو ٹی وی والوں سے کہو کہ وہ بدعقیدہ افراد کی گفتگو نہ دکھایا کریں اور سوال و جواب کے علاوہ موضوعاتی گفتگو تم سے زیادہ کروایا کریں اور یہاں کیو ٹی وی کا تسلسل منقطع نہ ہونے دیں۔ ان سے کہنا کہ وہ ہماری شکایت پر توجہ دیں۔ ان سے عرض کی کہ یہ باتیں ان تک پہنچا دوں گا۔ درگاہ شریف سے باہر آئے تو خوش تر صاحب ہمیں دہلی کے اس علاقے میں لے گئے جہاں بہت سے مطعم ہیں۔ لاہور کی فوڈ اسٹریٹ کی طرح تو نہیں لیکن یہاں بھی خاصی رونق تھی۔ حضرت شرر مصباحی سے گفتگو ہوئی تو وہ اپنی تحریروں سے بھی اچھے لگے۔

کچھ گفتگو از راہ تفنن اس موضوع پر بھی ہوئی جو ''جام نور'' اور ''افکار رضا'' میں شرر صاحب اور جناب صابر سنبھلی کے مابین ہورہی ہے۔ جناب سید صبیح الدین رحمانی کی خواہش ہے کہ نعت رنگ 18 میں شائع ہونے والا میرا مضمون ''رضا کی زباں تمہارے لیے'' مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہو اور اس پر جناب شرر مصباحی تقدیم و تبصرہ لکھیں۔ صبیح رحمانی کی یہ خواہش حضرت شرر صاحب تک پہنچ چکی تھی، وہ فرمارہے تھے کہ مارچ کے مہینے میں وہ یہ کام کردیں گے۔ پُرتکلف طعام کے بعد خوش تر صاحب نے پان کھلایا اور ذاکر نگر لے گئے۔ گزشتہ پندرہ برس سے آباد ہونے والے اس علاقے میں صرف مسلم آبادی ہے۔ یہاں سر راہ ہمیں مولانا یاسین اختر مصباحی نظر آگئے۔ جام نور کے دفتر میں وہ ہمارے ساتھ آگئے۔ جناب ذی شان نے احباب کو یہاں چائے پلائی پھر مولانا لیس اختر مصباحی کی دعوت پر ہم سب قریب ہی واقع ''دارالقلم'' پہنچے۔ مسجد و مدرسہ کی عمارت دیکھنے کے بعد لائب ریری میں دیر تک نشست ہوئی جس میں تصنیف وتالیف اور تحقیق و تدوین کے حوالے سے مفید مذاکرہ ہوا۔ اس دوران جناب راشد کاغذی کا فون آیا اور انہوں نے سب کو سلام کہا۔ جناب الحاج فاروق درویش کا فون آیا، وہ فرمارہے تھے کہ مَیں بھارت میں اپنا قیام دو دن زیادہ کرلوں اور 2 مارچ کو جمعہ کی نماز ان کی قیام گاہ سے ملحق مسجد میں پڑھاؤں۔ ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ وہ نہیں ہوں گے انہیں کاروباری میٹنگ کے لیے برما جانا ہے۔ ان سے عرض کی کہ کل انہیں جواب دوں گا۔ خوش تر صاحب کو کان پور سے فون آیا، وہ چاہ رہے تھے کہ مَیں لکھنؤ کے بعد انہیں وقت دوں۔ دعوت دینے والے یہ سب دوست شاید اس بات سے واقف نہیں تھے کہ پاکستان سے آنے والوں کے پاس چند شہروں کا ویزا ہوتا ہے، ان شہروں کے سوا سفر نہیں ہوسکتا۔ ان سے معذرت کی۔ نصف شب کے قریب ہم نے اجازت لی۔ دارالقلم کی مطبوعات کا سیٹ بھی کو دیا گیا۔ مولانا اسید الحق نے توسل اور استقامت کے موضوع پر اپنے جد اعلیٰ کی تحقیقی تصنیف ''احقاقِ حق'' بھی مجھے دی۔ اس کتاب کا انہوں نے ترجمہ کرتے ہوئے تخریج بھی شامل کی ہے۔ شرر صاحب بھی ہوٹل پہنچانے ساتھ تشریف لائے، ان کا فرمانا تھا کہ صبح روانگی سے قبل ان کے ہاں کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ عرض کی کہ وقت کم ہوگا اور دن میں ٹریفک کا ازدحام ہوگا، ان شاء اللہ آئندہ یہ سعادت حاصل کروں گا۔ خوش تر صاحب نے فرمایا وہ صبح بارہ بجے آئیں گے اور مجھے ایرپورٹ پہنچائیں گے۔ ان سے عرض کی کہ نصف گھنٹا پہلے مجھے فون کردیجئے گا۔ ہوٹل آکر تھکن کے باوجود مَیں نے کوشش کی کہ جام نور کے لیے اپنی تحریر پوری کرلوں۔ کچھ دیر لکھتا رہا لیکن مکمل نہ کرسکا۔ صبح خوش تر صاحب نے فون کیا اور بتایا کہ ان کے بھائی منظر سبحانی آرہے ہیں وہ مجھے ایرپورٹ پہنچادیں گے۔ عرض کی کہ میں خود چلا جاتا ہوں، وہ کہنے لگے بارہ بجے منظر میاں آجائیں گے۔ انہیں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ایک بج کر چالیس منٹ پرواز کا وقت تھا۔ پون بجے منظر میاں آئے تھے۔ جب ایرپورٹ پہنچے تو دو بج رہے تھے۔ حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی کو ردولی شریف اس سانحے کی اطلاع کی۔ مجھے احساس تھا کہ انہوں نے تشہیر کی ہوئی ہے اگر نہ پہنچا تو انہیں بہت تکلیف ہوگی۔ ایرپورٹ ہی سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے لیے چار بجے بھی پرواز ہے۔ اس کی ٹکٹ خریدی۔ سیٹ بھی مل گئی اور جہاز بھی وقت پر روانہ ہوا۔ مولانا قاری محمد احمد صاحب بقائی احباب کے ساتھ دو بجے دوپہر سے ایرپورٹ ہی پر میرے منتظر تھے۔ وہ مجھے لکھنؤ شہر کے کیفے

ذائقہ لے گئے جہاں مختصر طعام کے بعد ایک مسجد میں مغرب ادا کی۔ یہاں جناب قاری ذاکر، روزنامہ راشٹریا سہارا کے جناب حمایت جائسی اور قاری صابر صاحب بھی آ گئے۔ ہم ردولی شریف کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے بھر عالم اسلام کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ راستے میں اس صوبے کے گورنر کی گاڑی بھی ریلوے کراسنگ پر کھڑی تھی۔ ان کے لیے الگ راستہ نہیں رکھا گیا وہ بھی گاڑیوں کی قطار ہی میں گزرے۔ دارالعلوم مخدومیہ، رضا نگر نزد ریلوے اسٹیشن، ردولی شریف کے باہر مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب ہمارے منتظر تھے۔ راستہ بھر ان کے فون آتے رہے تھے اور وہ مسافت کی بابت پوچھتے رہے۔ ہمیں اسی مکان میں لے جایا گیا جہاں پہلی مرتبہ ہم آئے تھے۔ صباح الدین صاحب نے استقبال کیا۔ مولانا عبدالمصطفیٰ نے کہا کہ میرا خطاب ساڑھے گیارہ بجے ہوگا۔ پھر ایک گھنٹا بعد بتایا، یہ وقت بدلتا رہا۔ وہ گزشتہ جلسے کا احوال دیکھ چکے تھے کہ میرے خطاب کے بعد مجمع نہیں ٹھہرا تھا لیکن بہت دیر بعد خطاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لوگ نو بجے شب سے آئے بیٹھے ہوں تو کب تک بیٹھیں گے۔ میں بھی صبح سے سفر میں خاصا تھکا ہوا ہوں۔ آرام کا کوئی وقت نہیں ملا تھا۔ مولانا بقائی صاحب میرے ساتھ رہے، دیگر احباب جلسہ گاہ چلے گئے تھے۔ ANI نیوز ایجنسی کے مظہر آزاد صاحب مجھ سے انٹرویو کے لیے آ گئے۔ ایک گھنٹا ان کے ساتھ رکارڈنگ میں گزر گیا۔ فریاد علی صاحب ملنے آئے وہ صاحب زادہ تسلیم رضا صاحب کے ساتھ بریلی شریف سے آئے تھے۔ وہ دو دن بریلی شریف کے لیے جا رہے تھے۔ انہیں بتایا کہ میرے پاس اوپن ویزا نہیں ہے۔ صاحب زادہ تسلیم رضا صاحب تشریف لائے۔ ان سے ملاقات اور کچھ دیر بات ہوئی۔ بالآخر ہمیں جلسہ گاہ لے جایا گیا۔ الہ آباد کے جناب آصف سیفی نظامت کر رہے تھے، کیا خوب انداز اور الفاظ دیکھنے سننے کو ملے، برجستہ فقرے اور شگفتہ الفاظ وہ اپنی کھنکتی گرجتی آواز میں عمدگی سے ادا کر رہے تھے۔ مجھ گناہ گار کے لیے محبت میں وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گئے۔ اسٹیج پر قاضیٔ بنارس حضرت مولانا غلام یاسین صاحب خلیفۂ حضرت مفتی اعظم (علیہ الرحمہ) بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت نے بنارس کے لیے دعوت دی۔ عرض کی کہ آئندہ کسی سفر میں پروگرام بن سکے گا۔ جناب دل کش رانچوی نے میرے خطاب سے قبل منقبت پڑھی۔ رات دو بجے میرا خطاب شروع ہوا۔ مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی کی محنتوں کا ہر کوئی معترف ہے۔ مسلکِ حق کے لیے وہ بہت کام کر رہے ہیں۔ ردولی شریف کے قرب و جوار سے ٹریکٹر ٹرالیوں میں لوگ بڑی تعداد میں آئے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے خطاب جاری رہا۔ صلوۃ وسلام صاحب زادہ تسلیم رضا نوری نے پڑھایا۔ حضرت قاضیِ بنارس کی دعا پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ مصافحے کے لیے ہجوم ٹوٹ پڑا۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم تاج دارِ ردولی حضرت سیدنا مخدوم شاہ عبدالحق ردولوی علیہ الرحمہ کی درگاہ پر آئے۔ مزار شریف پر حاضری دی۔ دارالعلوم مخدومیہ کی مسجد میں آ کر نماز فجر ادا کی اور لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا قاری محمد احمد صاحب بقائی، قاری ذاکر صاحب، قاری صابر صاحب نے راجستھان کے ایک بزرگ کے ہاں ناشتے کا اہتمام کیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد مولانا بقائی صاحب کے ساتھ لکھنؤ گھومتے ہوئے ایرپورٹ آ گئے۔ اس سفر میں آج 28 فروری کی شب ممبئی میں آخری پروگرام تھا۔ لکھنؤ سے پرواز براستہ دہلی تھی، موسم ابر آلود تھا اور بارش شروع ہو چکی تھی۔ پرواز بہت ناہموار (bumpy) رہی اور دہلی سے کچھ تاخیر سے روانہ ہوئی۔ خوش تر نورانی صاحب کے جام نور کے لیے جو

تحریر شروع کی تھی وہ کاغذ جانے کہاں رہ گئے۔ دہلی سے ممبئی کے سفر میں از سرِ نو لکھنا شروع کیا اور ممبئی پہنچنے تک مختصر تحریر مکمل کرلی تاکہ محمد زبیر قادری کو دے سکوں، وہ کمپوز کر کے ای میل کے ذریعے دہلی بھجوا دیں گے۔

طیارے کی ممبئی آمد کا وقت ساڑھے دس بجے شب تھا لیکن پرواز ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچی۔ جناب محمد زبیر قادری اور جناب محمد اسحٰق برکاتی استقبال کو موجود تھے۔ ایرپورٹ سے سیدھا حضرت سیدنا حاجی علی بخاری علیہ الرحمہ کی درگاہ پہنچے، اسی کے احاطے میں جلسہ تھا۔ یہاں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے نواسے مولانا مفتی محمود اختر سے ملاقات ہوئی۔ درگاہ میں بغداد شریف سے آئے ہوئے ایک بزرگ حلقہ ذکر سجائے ہوئے تھے۔ شہر سے حضرات و خواتین خاصی تعداد میں مجھے سننے کے لیے آئے تھے۔ حلقۂ ذکر کے بعد خطاب شروع ہوا اور دو بجے شب تک جاری رہا۔ محمد زبیر قادری نے مختصر سے وقت میں اس جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود وہ چند ساتھیوں کے ساتھ عمدہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ نوجوان ملازمت کرتے ہیں اور اپنی نیندیں قربان کر کے رات گئے تک دینی مسلکی تحریری، تدریسی اور تنظیمی کام کرتے ہیں۔ انہیں کوئی خاص تعاون یا سرپرستی بھی کسی فرد یا ادارے کی طرف سے حاصل نہیں۔ ان کے جذبے متاثر کن ہیں۔ اللہ کریم ان کو اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔

جلسے کے بعد ان سے پوچھا کہ کہیں کھانا ملے گا؟ معلوم ہوا کہ دلی دربار ریسٹورنٹ ایک علاقے میں تین بجے تک کھلا رہتا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں چلوں لیکن ہجوم کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا۔ دلی دربار کے کھانے عمدہ ہوتے ہیں۔ وہاں طعام کے بعد زبیر صاحب ممبئی سنٹرل میں سویٹ ہوم ہوٹل لے آئے۔ اسے حنیف صاحب نے بہت اچھا بنا دیا ہے۔ احباب نے میرا سامان باندھنے میں تعاون کیا۔ فجر تک سب ساتھ رہے۔ محمد عمران، محمد اسحٰق برکاتی، فرید نثار، شمشاد، ساجد، امجد صاحبان بہت محبت و عقیدت رکھتے اور بہت خدمت کرتے ہیں۔ اللہ کریم ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ صبح نو بجے زبیر صاحب اور ان کے ساتھی ایرپورٹ پہنچانے آئے۔ ایرپورٹ جاتے ہوئے فون پر سب احباب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ حاجی عبدالمجید صاحب کو بتایا کہ الحاج فاروق درویش صاحب سے بات نہیں ہوسکی، وہ خود یہاں رہتے تو ضرور رک جاتا۔ ان شاء اللہ جب بھی آؤں گا انہیں ضرور وقت دوں گا۔ ممبئی میں حضرت حاجی علی علیہ الرحمہ کی درگاہ پر اجتماع کی اجازت کے لیے بھی فاروق درویش صاحب نے وہاں کے ٹرسٹیوں کو سفارش کی تھی۔ ردولی شریف میں حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ صدیقی سے وہ بہت تعاون کرتے ہیں۔ روزنامہ ''انقلاب'' کے جناب ندیم صدیقی چاہتے تھے کہ کچھ وقت انہیں دوں، وہ اپنے احباب سے ملاقات کروانا اور بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ محمد زبیر صاحب قادری کے ہاتھ انہوں نے دو مفید کتابیں میرے لیے بھجوائی تھیں۔ الحاج محمد سعید نوری سے بھی نہیں مل سکا۔ کم دنوں میں اتنی جگہوں کا سفر اور اتنے پروگرام ہوگئے۔ ویزا کی سہولت ہو تو دوستوں کے شکوے جاتے رہیں گے۔ ایرپورٹ پر جناب وسیم الاسلام ملے اور عزت افزائی کی۔ ان سب کو دعائیں دیتا اپنے پیارے وطن واپسی کے لیے پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہوا اور بفضلہٖ تعالیٰ اسی سہ پہر اپنے وطن اپنے گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تبصرۂ کتب

رضا اکیڈمی کی عظیم اشاعت: "جہانِ مفتیِ اعظم" ایک مطالعہ

غلام مصطفےٰ رضوی، نوری مشن، مالے گاؤں

تاج دار اہل سنت شہزادۂ اعلیٰ حضرت حضور مفتی اعظم علامہ شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری نوری بریلوی علیہ الرحمۃ الرضوان (ولادت ۱۳۱۰ھ/ وصال ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) نے اپنی حیاتِ مستعار کا لمحہ لمحہ دعوتِ حق، تبلیغ دین اور اصلاح عقاید میں گزارا۔ آپ کی حیات و خدمات کی مختلف جہتیں ہیں: فقاہت، علمِ حدیث و تفسیر میں مہارت، فتویٰ نویسی، تقویٰ و طہارت، شریعت کی پاس داری، اصلاحی کارنامے، تصنیف و تالیف، اسلامی علوم وفنون کا فروغ، اسفار، بیعت و ارشاد، ادبی خدمات اور ملکی وملی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی وقیادت وغیرہ ہر جہت میں آپ ممتاز ونمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ پر نظر رکھنے والے بخوبی آگاہ ہیں کہ بیس ویں صدی میں کیسے کیسے بڑے واقعات ظہور میں آئے اور طوفان اٹھے نیز مختلف طریقوں سے اسلام کے خلاف محاذ آرائی ہوئی اور داخلی و خارجی طور پر فتنے وجود میں آئے۔ ہر ہر موڑ پر حضور مفتیِ اعظم قدس سرہ نے مسلمانوں کو سنبھالا دیا اور امام احمد رضا قدس سرہ کے مشن کو آگے بڑھایا۔

حضور مفتی اعظم قدس سرہ کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں پر سیکڑوں مقالہ جات قلم بند کیے جاچکے ہیں اور کتب و جرائد شائع ہو چکے ہیں۔ اس بابت راقم کے علم کے مطابق تین فہرستیں شائع ہوئیں:

(۱) استقامت ڈائجسٹ، مفتیِ اعظم ہند نمبر (۱۹۸۳ء): مفتیِ اعظم قدس سرہ پر کتب و رسائل کے تحت رضوان الهدیٰ رضوی نے ایک فہرست مرتب کی جس میں ۲۸ر کتب و رسائل شمار کرائے جن میں ۲ کی صراحت غیر مطبوعہ کے طور پر ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: استقامت ڈائجسٹ کان پور، مفتیِ اعظم نمبر ص۶۰۰_۶۰۱)

(۲) یادگارِ رضا، مفتیِ اعظم نمبر (سال نامہ ۲۰۰۶ء): علامہ محمد عبدالمبین نعمانی مصباحی نے کتابیات مفتیِ اعظم ہند کے عنوان سے فہرست مرتب فرمائی۔ اس میں ۵۵ر کتب و رسائل ذکر ہوئے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں: سال نامہ یادگارِ رضا ممبئی ۲۰۰۶ء، مفتیِ اعظم ۳۴ص تا ۳۷ص)

(۳) جہانِ مفتیِ اعظم (۲۰۰۷ء): جہانِ مفتیِ اعظم میں ڈاکٹر محمد اسد نوری پیلی بھیتی (علیگ) نے "حضور مفتی اعظم کا ذکر رسائل و اخبارات میں" عنوان کے تحت ۲۸۵ مقالات و کتب، رسائل و جرائد اور مضامین کی فہرست مرتب کی جن میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں ہی شامل ہیں۔ ساتھ ہی جن میں جزوی

تذکرے آئے وہ بھی شمار کیے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں: جہانِ مفتی اعظم (مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی، ص ۹۶۹ تا ۹۸۶ص)

علاوہ ازیں حضور مفتی اعظم کی حیات میں ہی آپ کی دینی خدمات و اسفار کی رپورٹیں اس وقت کے مشہور و معروف اخبارات و رسائل میں تواتر سے شائع ہوئیں جن میں دبدبۂ سکندری رام پور، ہفت روزہ الفقیہ امرت سر، روزنامہ انجام دہلی، ماہ نامہ نوری کرن بریلی قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح حضور مفتی اعظم کے وصال پر الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ پرنٹ میڈیا نے بھی خبریں دی، اس تعلق سے استقامت ڈائجسٹ کے مفتی اعظم نمبر میں ۱۴۱ر اخبارات کی فہرست ہے۔

خصوصی اشاعت کے بطور جو نمبرات شائع کیے گئے ان کی تعداد استقامت ڈائجسٹ کے متذکرہ نمبر میں ۶، یادگارِ رضا میں ۱۰، جہانِ مفتی اعظم میں ڈاکٹر محمد اسد نوری نے ۸ اور مولانا مقبول احمد سالک مصباحی نے اپنے اداریے میں ۹ درج فرمائی۔

حضور مفتی اعظم قدس سرہ پر اب تک جتنے بھی قلمی و تحریری اور اشاعتی کام انجام پائے اور نمبرات منظر عام پر آئے ان میں ایک منفرد کام ''جہانِ مفتی اعظم'' کی شکل میں حال ہی میں رضا اکیڈمی ممبئی سے الحاج محمد سعید نوری مدظلہ العالی اور ان کے احباب کی فرمائش پر منصۂ شہود پر آیا۔ بڑے سائز کے ۱۱۷۶ر صفحات پر مشتمل اس تاریخی نمبر کی ترتیب و تدوین علامہ محمد احمد مصباحی (صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور)، علامہ عبدالمبین نعمانی مصباحی (مہتمم دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ) اور مولانا مقبول احمد سالک مصباحی (استاذ دارالعلوم حنفیہ رضویہ ممبئی) نے فرمائی۔ تصحیح و تخریج کا مرحلہ مولانا مقبول احمد سالک مصباحی نے طے کیا اور اسے خلوص و لگن سے تیار کیا۔

یہ نمبر کمیت کے لحاظ سے جتنا ضخیم ہے کیفیت میں اس سے بڑھ کر اور بہت سی مجلدات پر بھاری ہے نیز دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ بطور ریفرنس بک کے مستقبل میں بھی محققین اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

جہان مفتی اعظم ۲۴ر ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی فہرست ذیل کے مطابق ہے:

(۱)	پہلا باب	سوانحی خاکہ
(۲)	دوسرا باب	بیعت و ارشاد، اجازت و خلافت
(۳)	تیسرا باب	سیرت و کردار، مثالی شخصیت
(۴)	چوتھا باب	تبحر علمی، فضل و کمال
(۵)	پانچواں باب	روحانیات و تصرفات، کرامات

(۶)	چھٹا باب	فقہی بصیرت، فتویٰ نویسی
(۷)	ساتواں باب	فنِ حدیث میں رسوخ وعبقریت
(۸)	آٹھواں باب	ذوقِ شعر وسخن، عشقِ رسول ﷺ
(۹)	نواں باب	الملفوظ کی ترتیب وتدوین
(۱۰)	دسواں باب	تصنیفی وتالیفی خدمات
(۱۱)	گیارھواں باب	دینی واصلاحی خدمات
(۱۲)	بارھواں باب	تنظیمی وتحریکی خدمات
(۱۳)	تیرھواں باب	اسفار ومشاہدات کی روشنی میں
(۱۴)	چودھواں باب	رسائل واخبارات کی روشنی میں
(۱۵)	پندرھواں باب	علماے حجاز کی نظر میں
(۱۶)	سولھواں باب	اربابِ علم ودانش کی نظر میں
(۱۷)	سترھواں باب	اقران ومعاصرین کی نظر میں
(۱۸)	اٹھارھواں باب	خلفا وتلامذہ، مریدین ومستفیدین
(۱۹)	انیسواں باب	شہر بریلی کے علما ودانش وران
(۲۰)	بیسواں باب	حج وزیارتِ حرمین شریفین
(۲۱)	اکیسواں باب	مکتوباتِ مفتیِ اعظم
(۲۲)	بائیسواں باب	وصالِ پر ملال
(۲۳)	تئیسواں باب	مناقبِ مفتیِ اعظم
(۲۴)	چوبیسواں باب	آثار وتبرکاتِ نوری

جہانِ مفتیِ اعظم کی چند خصوصیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جہانِ مفتیِ اعظم میں دو فہرستیں ہیں جو بہ لحاظِ حروفِ تہجی اور بہ لحاظِ ابواب ترتیب دی گئیں۔ آغاز میں شذرات کے تحت پیغامات وتاثرات، انتخابِ کلامِ نوری، جہانِ مفتیِ اعظم کی تدوین وتصحیح اور اشاعت سے متعلق احوال ومراحل، ۲۵ رسالہ عرس نوری کے انعقاد واہتمام کی رپورٹ اور اس سلسلے میں رضا اکیڈمی کے ملک گیر سطح کے اقدامات دیے گئے ہیں۔

جہانِ مفتیِ اعظم کی ترتیب جدید طریقۂ تدوین کے مطابق دی گئی۔ مشمولات اس طرح ہیں:

مقالات ومضامین کی تعداد	۱۱۲

مناقب مفتی اعظم ۴۱

آثار وتبرکات نوری (چہار رنگ ۴۸ رصفحات پر مبنی) ۱

مشمولات کی کُل تعداد = ۱۵۴

(۲) مرتبین نے اس نمبر کو نکھارنے میں بڑی سعی و کاوش فرمائی۔ غیر مستند روایات و مہمل واقعات کا اخراج، جدید قواعد کی رعایت، حوالوں کی تخریج اور اصل سے مطابقت، عربی عبارتوں کی تصحیح، بقدرِ ضرورت حذف و اضافہ وغیرہ۔

مصادر و مآخذ تخریجات کے تحت ۸۵ رکتابوں کی فہرست مطبع کی نشان دہی کے ساتھ دی گئی ہے۔

(۳) ہر باب کے آغاز میں تعارفی نوٹ لگائے گئے ہیں جو مولانا مقبول احمد سالک مصباحی نے لکھے ہیں۔ پہلے باب کے آغاز میں علامہ محمد احمد مصباحی کا بھی نوٹ ہے جو بڑا اہم ہے اور محققین، قلم کاروں، عقیدت کیشوں کے لیے راہ نما ہے۔

(۴) اس نمبر میں دو پہلو بھی ضروری تھے جو اہتمام کے ساتھ شامل کیے گئے۔ (۱) فتاویٰ مصطفویہ (از مفتی اعظم ہند) سے چند فتاووں کا انتخاب جسے الحاج محمد سعید نوری نے پیش کیا (اس کے تحت ۸ رفتاویٰ نقل کیے گئے ہیں) (۲) انتخاب کلام نوری (مرتب مولانا مقبول احمد سالک مصباحی، ماخوذ از سامانِ بخشش)

(۵) فتویٰ نویسی حضور مفتی اعظم کی حیات کا نمایاں باب ہے۔ آپ نے یہ فن وراثت میں پایا۔ اور آپ اس فن میں اپنے والد ماجد امام احمد رضا قادری حنفی کے لائق و فائق جانشین تھے۔ جہانِ مفتی اعظم کا چھٹا باب آپ کی فقہی بصیرت اور فتویٰ نویسی سے متعلق ہے۔ جس میں علامہ محمد احمد مصباحی، مفتی محمد نظام الدین رضوی، مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی، مفتی مجیب اشرف رضوی، علامہ شمس الہدیٰ مصباحی، مفتی آلِ مصطفیٰ مصباحی، مفتی صدرالوریٰ مصباحی کے مضامین بڑے تحقیقی ہیں۔

(۶) فتویٰ نویسی میں مفتی اعظم قدس سرہ ید طولیٰ رکھتے ہی تھے۔ ساتھ ہی فنِ حدیث میں بھی درک رکھتے تھے۔ ساتواں باب اسی موضوع پر ہے۔ اس باب میں چار مقالات ہیں۔ مولانا مقبول احمد سالک مصباحی کے بقول: ''چاروں ہی معرکۃ الآرا ہیں۔ رئیس القلم علامہ ارشد القادری کا مقالہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔''

مفتی اعظم قدس سرہ کی تصانیف ورسائل کا تعارف، شعر و ادب اور حزم واحتیاط، اصلاحی خدمات و اسفار، دینی تصلب و سیاسی اصلاحات، اخلاق و ایثار، مکتوبات وتبرکات، بیعت و ارشاد، سفر آخرت، خلفا و تلامذہ اور اربابِ علم وفضل کے وقیع تاثرات و آرا پر بھی مستقل باب ہیں۔ اداریہ پُرمغز اور ایک مستقل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اتنے ضخیم اور تاریخی نمبر کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضور مفتی اعظم کی شخصیت بہت بلند ہے اور آپ پر ابھی بھی بہت کام کرنے ہیں۔ ۲۴؍ابواب پر مشتمل جہانِ مفتی اعظم نئی سمتوں میں کام کی راہیں ہم وار کرے گا اور اہلِ قلم یقیناً اس کے ذریعے حضور مفتی اعظم کی شخصیت اور خدمات کے نئے نئے گوشوں پر تحقیقی کام کے لیے راغب ہوں گے۔ اس عظیم و ضخیم اور خوب صورت نمبر کی تیاری میں حضور مفتی اعظم کے فیوض و برکات کی کارفرمائی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سی خصوصیات ہیں جو اس نمبر کا خاصہ ہیں جن کا ذکر طوالت کا سبب ہوگا۔ سر دست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جہانِ مفتی اعظم کی اشاعت کے سلسلے میں علامہ محمد مصباحی، علامہ عبدالمبین نعمانی، مولانا مقبول احمد سالک مصباحی اور الحاج محمد سعید نوری، رضا اکیڈمی کے ارکان و معاونین بھی لائقِ تحسین و مبارک باد ہیں۔

نوٹ: جہان مفتی اعظم کے حصول کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ فرمائیں۔ یہ نمبر ۲۰۰ روپے میں دستیاب ہے:

رضا اکیڈمی، ۵۲، ڈونٹاڈ اسٹریٹ، کھڑک، ممبئی ۹ فون: ۲۶۳۴۲۱۵۶ (۰۲۲)

"حیاتِ رضا کی نئی جہتیں" ـــــ ایک تعارف

مفتی ولی محمد رضوی، صدر سنی تبلیغی جماعت، باسنی، ناگور، راجستھان

بحمدہ تعالیٰ اب ہماری جماعت میں نوجوان علماے کرام و محققین حضرات نے قلم و قرطاس کے لیے کمر کس لی ہے اور بلند عزائم و پختہ جذبات کے ساتھ میدانِ عمل میں آچکے ہیں اور نئے نئے عناوین اور عمدہ مضامین سے نئی نئی جہتوں کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور ان باہمت حضرات کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی بھی ہوتی ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ قائم رہے اور اس میں تیزی آئے، آمین۔

جواں سال، جفاکش، مسلسل محنت کرنے والا محقق مولانا ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ چند سالوں ہی میں انہوں نے تیز گامی کے ساتھ کام کیا ہے اور نئے نئے میدان سر کیے ہیں کہ قریب دو درجن محققانہ کتب و رسائل کے مؤلف و مصنف ہوگئے ہیں۔ موصوف کی نگارشات کو اہلِ علم و فضل میں پذیرائی و قبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ کئی بار ملاقات ہوئی، ان کی کاوشوں اور محنتوں کی گُل کاری و گُل ریزی کا نظارہ کرنے کا موقع ملا۔ لگن و دھن کے پکے ہیں۔ جس کام میں جٹ گئے، تو بس اسے پورا کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ طوفان و مصائب سے ان کی پیشانی پر شکن نہیں آتی۔ اللہ کی ذات پر توکل کیے ہوئے ہیں۔ مجددِ اعظم امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کا عشق تو ان کے رگ و پے میں بسا ہوا ہے۔ وہ طے کر چکے ہیں کہ دنیا کے سامنے وہ خزانۂ رضا پیش کرنا ہے اور سچائیوں کو اُجاگر کرنا ہے کہ امام احمد رضا صرف

ایک مولانا ہی نہیں تھے۔ بلکہ علومِ اسلامیہ کے عالمِ باعمل و عارف کامل کا نام امام احمد رضا ہے۔ اُن کے دور میں جتنے علوم پائے جاتے تھے غالباً سب پر انہیں مہارت و دسترس حاصل تھی۔ ان کے اس نیک مقصد کو سمجھنے کے لیے موصوف کی حقیقت نگار تالیفات اس کا آئینہ ہیں۔ ابھی ابھی ان کی ایک تازہ کتاب ''حیاتِ رضا کی نئی جہتیں'' منظر عام پر آئی ہے۔ جو ترتیب کے طور پر نیا پن لیے ہوئے ہے۔ اس میں نئی جہتوں کا گلشن سجایا ہوا ہے۔ ایک عنوان ہے، ''کتبِ فقہ و حدیث وتفسیر وغیرہ پر حواشی و شروحات'' یہ بڑا معلوماتی ہے۔ موصوف نے علمی و تاریخی اعتبار سے ثابت کیا ہے کہ ۷ ھ سے لے کر امام احمد رضا کے دور سے پہلے تک قریب ۷ سو سالہ تاریخ میں علما و فقہا کی بڑی جماعت نے جو سرمایہ شروح و حواشی دیا ہے، وہ ۸۰ حضرات ہیں اور ۲۰۰ دو سو کتب پر حواشی لکھے ہیں۔ جو اہلِ علم حضرات اور علم دوست حضرات پر احسان عظیم ہے۔ ہم اس کو سراہتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

مگر اللہ کی عطاؤں کے جلوے دیکھیے کہ مجددِ اعظم امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے اپنے مختصر سے ۵۰ سالہ دور میں تنہا ۱۴۷ کتب تفسیر وفقہ و حدیث پر حواشی رقم فرما کر کمال کر دیا ہے۔ یہ کارنامہ رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔ جس کی مثال پہلے اور بعد کے دور میں نہیں ملتی۔ یہ سب فضلِ ربی اور عطاے رسول کریم ہے۔ نیز ہمارے محبوب محقق نے رسائلِ رضا کا عمدہ انداز میں بہترین تعارف کرایا ہے اور دعوت دی ہے کہ اہلِ علم جھانک کر، پڑھ کر امام احمد رضا کو دیکھیں کہ ان کی تحقیقات اور نظریات کیسے تھے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ، ہمارے موصوف محقق نے چند رسائل کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ نوادرات کا بے بہا خزانہ ہیں۔ چند کتب امام علام کی چند گھنٹوں کی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ بعض رسائل تو کتاب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً کوئی رسالہ ساٹھ صفحات کا ہے۔ مگر سو سو حوالوں سے مدلل ہے اور ان میں سیکڑوں آیات و احادیث اور اقوالِ صحابہ وفقہا جمع کر دیے گئے ہیں کہ مخالف کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی۔ بعض موقع پر بغیر کتب کے وہ فتاوے اور رسائل تحریر فرمائے کہ حیرت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ عطاے ربانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ محقق موصوف کی تحریر بھی عمدہ ہے۔ جس سے تعارفِ رضا خوبصورت انداز میں ہوا ہے۔ تحقیق کا انداز بھی اچھا ہے۔ اللہ کریم اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے و طفیل اس اہم خدمت کو قبول فرمائے۔ مؤلف موصوف کے علم اور فضل و کمال میں خوب خوب برکتیں عطا کرے۔ ان کی علمی کتابوں سے ہم سب کو مستفید فرمائے اور ان کو جزاے خیر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

****

اقبال احمد فاروقی۔ جن کی باتوں سے خوشبو آئے

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

علامہ اقبال احمد فاروقی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں خانقاہِ شمسیہ میں ہوئی۔ خانقاہِ شمسیہ کے صدر الصدور حضرت مولوی شمس الدین تھے۔ نہایت درویش طبع، ہر ایک سے محبت کرنے والے، سب کے دوست اور سب کے خیر خواہ۔

خانقاہِ شمسیہ اصل میں نادر کتابوں کی دوکان تھی جس میں حضرت خواجہ قمر الدین، گلزار احمد اور اولیائے لاہور کے مؤلف لطیف ملک سے لیکر مجھ ہیچ مداں تک کتابوں سے پیار کرنے والے سب آتے تھے۔ سب کو اپنے ذوق کے مطابق یہاں سے کتابیں مل جاتی تھیں۔ کسی کو اپنی پسند کی کتابیں ڈھونڈنی نہیں پڑتی تھیں۔ مولوی شمس الدین ہر آنے والے کے ذوق سے واقف تھے۔ جونہی خانقاہِ شمسیہ میں آنے والا اپنی نشست سنبھالتا تو اس کے ذوق اور پسند کی کتابیں اس کے سامنے آجاتیں۔ ان باذوق آنے والوں میں حکیم اہلسنت محمد موسیٰ امرتسری اور علامہ اقبال احمد فاروقی بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ فاروقی صاحب کو سلامت رکھے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کے دینی مشن کو اب آپ ہی آگے بڑھا رہے ہیں۔ میری اُن سے رفاقت پرانی ہے۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ علامہ اقبال احمد فاروقی مدظلہ اُس زمانے میں بھی فنِ گفتگو کے امام تھے، بلکہ امام الائمہ کہیے۔ ہم قدر دانوں کا یہ حال تھا کہ ان کے ملفوظات سننے کے لیے جمعہ کے روز دہلی دروازے کے باہر ''کوتوالی مسجد'' میں پہنچ جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ سرراہے مل جاتے اور ہم انہیں کسی ریستوران میں بٹھا لیتے، اور ان کی باتوں سے مستفید و محظوظ ہوتے۔ اس وقت یہ عالم ہوتا کہ وہ کہیں، اور سنا کرے کوئی۔

آج میں ماضی کے دریچوں سے جھانکتا ہوں تو علامہ فاروقی مجھے شمس الدین مرحوم بانی خانقاہِ شمسیہ کے تعزیتی جلسے میں دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، انہوں نے خانقاہِ شمسیہ کا حال بیان کرتے ہوئے وہ سماں باندھا تھا کہ حاضرین مسحور ہوگئے تھے۔ اس تعزیتی جلسے کا اہتمام حکیم اہل سنت محمد موسیٰ امرتسری نے کیا تھا اور اس میں کئی دوستوں نے رقت انگیز تقریریں کی تھیں۔ اس تعزیتی جلسے میں پڑھا جانے والا میرا مقالہ آغا شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ چٹان میں شائع کردیا تھا۔ آغا شورش بھی خانقاہِ شمسیہ کے حاضر باشوں میں شامل تھے۔ اور یاد آیا، اس موقع پر علامہ قاضی عبدالنبی کوکب مرحوم نے بھی بڑی عمدہ اور مرصع تقریر کی تھی اور دورانِ تقریر موقع محل کی مناسبت سے ترنم سے خوب صورت اشعار بھی سنائے تھے۔ اس روز ہمیں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ کوکب صاحب کے گلے میں تو ''نور'' ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہمارے دوست پیر طریقت سبطین شاہ جہانی، مولانا بشیر حسین ناظم اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، تینوں انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ جہاں سے اوّل الذکر دو حضرات کو کوثر نیازی اپنی وزارتِ حج و اوقاف میں لے گئے تھے۔ جس پر ناظم صاحب یوں تبصرہ کرتے کہ مولوی صاحب نے ایک ہی تو نیک کام کیا ہے کہ ہمیں وزارتِ حج و اوقاف میں لے گئے۔ فاروقی صاحب وزارتِ حج و اوقاف میں نہیں گئے، بال بال بچ گئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اسلام کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا۔ ناشر بن گئے اور نادر و نایاب کتابیں ڈھونڈ کر شائع کیں۔

مولانا صلاح الدین سعیدی صاحب نے مولانا فاروقی کے ملفوظات ''باتوں سے خوشبو آئے'' مرتب کر کے ہم سب ''نیاز مندانِ فاروقی'' پر احسان فرمایا ہے۔ اگر وہ یہ کتاب مرتب نہ کرتے تو نہ جانے ہمیں اور کتنی دیر انتظار کرنا پڑتا۔ اب کچھ باتیں اس کتابِ مستطاب پر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور وہ بھی صرف اس کتاب کے ایک باب ''عیسائی مبلغین اور علمائے اسلام'' کے بارے میں۔ میرے نزدیک یہ اس کتاب کا بہت اہم باب ہے۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ برصغیر میں فرنگی اقتدار قائم ہوتے ہی متحدہ ہندستان میں عیسائی مبلغین یعنی مشنریز کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، لیکن اس اجمال کی تفصیل علامہ فاروقی کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں:

''ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط پر ۱۸۱۳ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا، جس کی رو سے ''انجمن ترقی علومِ عیسائیت'' کے آرک بشپ کو اختیار دیا گیا کہ وہ برِصغیر ہند میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اپنے مبلغین بھیجے۔ چنانچہ انگلینڈ سے پادریوں کی ایک جماعت ۱۸۱۴ء میں کلکتہ پہنچی اور اپنا کام کرتی چلی گئی۔ عیسائی مبلغین کی کھیپ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں انگلستان کے مشہور مبلغین نے برصغیر میں عیسائی تبلیغ کی بنیاد رکھی، ان میں ہنری مارٹن، کلاڈلیس، لوکا ئین، ڈاکٹر ڈف، مسٹر جن سن، پادری جوشا مارش اور ولیم وارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ اپنی علمی قابلیت میں شہرۂ آفاق تھے اور اپنی تبلیغی قابلیت کی بنا پر سارے یورپ میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ابتدائے کار میں ان عیسائی علما نے فورٹ ولیم کالج میں اساتذہ اور تلامذہ کی حیثیت سے انجیل کے تراجم و تفاسیر کی اشاعت کا ایک شعبہ قائم کیا اور مشرقی زبانوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے اور نہایت پُر امن طریقے سے عیسائی مذہب کی خوبیاں بیان کرتے۔ ان کے منادی کرنے والے بازاروں، چوراہوں اور میلوں کے اجتماعات میں چلے جاتے اور عوام کے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ ۱۸۵۲ء میں ان عیسائی تبلیغی اداروں نے ملک میں ۱۳۴۶ اسکول قائم کر لیے۔ جن میں ۴۷۵۰۴ عیسائی لڑکے اور لڑکیاں پاک و ہند کی علاقائی زبانوں سے واقف ہو کر عیسائی تبلیغ کے لیے تیار ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۱۲۶ ایسی درس

گاہیں قائم کردی گئیں جن میں ۱۴۵۶۲ نوجوانوں کو فنِ مناظرہ میں طاق کرکے ملک کے مختلف حصوں میں بھیج دیا گیا۔ دوسری طرف انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ساتھ ۲۵ پرنٹنگ پریس قائم کردیے گئے جن میں عیسائی تبلیغی لٹریچر چھپ چھپ کر برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچنے لگا۔'' (صفحہ ۱۱۶۔۱۱۷)

یہ پس منظر تحریر کرنے کے بعد علامہ فاروقی نے ان علماے اسلام کی فہرست درج کی ہے، جو اس موقع پر عیسائی مبلغین کا راستہ روکنے کے لیے ڈٹ گئے تھے اور جنہوں نے علمی محاذ پر عیسائی مبلغین کو شکست فاش دی تھی۔ ان علماے اسلام میں مولانا احمد اللہ مدراسی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا فضل امام خیر آبادی، مولانا عنایت علی چریاکوٹی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا احمد علی سہارن پوری، حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولان غلام دستگیر قصوری اور مولانا حافظ ولی اللہ لاہوری کے اسماے گرامی قابل ذکر ہیں۔

''عیسائی مبلغین اور علماے اسلام'' میں علامہ فاروقی نے اختصار کے ساتھ جن علماے اسلام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکرِ خیر کیا ہے، ان میں حضرت شاہ عبدالعزیز، مولانا آلِ حسن، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا اشراف الحق کا ذکر خیر بہت ہی روح پرور اور ایمان افروز ہے۔ مَیں نے یہاں خاص طور پر اس باب کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ علامہ فاروقی کی معلومات اس سلسلے میں خاصی وسیع ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اس موضوع پر مزید تفصیل سے لکھیں تاکہ ہماری نئی نسل کو معلوم ہو کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں عیسائیت سے بچانے کے لیے کیا کیا قربانیاں دیں۔ خاص طور پر اعلیٰ حضرت پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علامہ فاروقی صاحب کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تادیر سلامت رکھے اور ان کی خداداد ہمت اور قابلیت سے ہمیں مستفیض فرماتا رہے۔ آمین!

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۳ر فروری ۲۰۰۷ء)

****

پروازِ خیال پر اک طائرانہ نظر

پروفیسر ڈاکٹر محمد فاروق احمد صدیقی

صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر امبیڈکر یونی ورسٹی، مظفر پور، بہار

سادگی، بے ریائی، خوش روئی، خوش مزاجی، خوش کلامی، خوش اخلاقی، عاجزی، انکساری، فتادگی، نفاست، لطافت، حلاوت، دینی حمیت و حرارت اور عالمانہ وقار و تمکنت کے اجزا و عناصر سے جو پیکرِ جمیل تیار ہوا

ہے، اسی کا نام غلام جابر شمس ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا ظاہر زیادہ منور ہے یا باطن، کیا متوازن شخصیت پائی ہے۔ مَیں نے اہلِ سنت کے نژادِ نو میں جن لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا ہے۔ اُن میں غلام جابر شمس علامہ اقبالؔ کے درجِ ذیل شعر کے مرکزی خیال کی طرح ہیں:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے ☆ تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے یوں تو علوم و ادبیات کے مختلف شعبہ جات میں تخلیقیت کے جوہر دکھلائے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ تحقیق کی دنیا کے آدمی ہیں۔ یہی اُن کا فطری مزاج ہے اور مذاق بھی۔ اسی میں وہ شب و روز معروف اور منہمک رہتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک درجن سے زیادہ تحقیقی مسودات بالکل فائنل شکل میں ان کی الماری میں بند ہیں اور کسی مناسب وقت پر اشاعت و طباعت کے منتظر ہیں۔ اسی سے تحقیقی کاموں میں ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ جو اقبالؔ نے کہا ہے۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ☆ لیکن اسے کبھی تنہا بھی چھوڑ دے

چنانچہ اقبالؔ کے سعادت مند معنوی شاگرد ہونے کے ناطے جب جب انہوں نے پاسبانِ عقل کو تھوڑی مہلت دیدی ہے کہ جاؤ چائے وغیرہ پی کر آجاؤ، اس درمیان جو تحقیقی کاموں سے فرصت ملی ہے، تو گرد و پیش کے حالات اور دیگر تہذیبی و معاشرتی مسائل نے بھی اپنا اپنا استحقاق اُن پر جمایا ہے۔ میرے خیال میں پیش نظر مجموعہ "پروازِ خیال" کے مضامین و مشتملات انہیں اوقات و لمحات کی حسین پیداوار ہیں۔ اس سے اُن میں فکری سطح پر بڑا متنوع اور بوقلمونی ملتی ہے، بعض مسائل میں پر انہوں نے غور و فکر سے کام لیا ہے اور بعض بالکل الہامی اور ارتقائی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ یہاں مصنف زندگی کا نقاد بھی ہے اور مبصر بھی، ایسا نقاد اور مبصر جو زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت، خوش رنگ اور خوش آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ ادب کا اپنا مقصد زندگی کی تعمیر، تشکیل، تزئین اور تطہیر ہے۔

پروازِ خیال کی تحریریں نہ تحقیق ہیں، نہ تنقید، نہ افسانہ، نہ ڈرامہ، نہ ناول، نہ رپوتاژ، نہ سنجیدہ مقالہ۔ مگر یہ انشائیہ کے قریب ضرور ہیں، کیونکہ انشائیہ ذہنی ترنگ کو کہتے ہیں۔ ایک انشائیہ نگارش جہات کی سیر کرتا ہے۔ کاہ سے لے کر کہکشاں تک اور ذرّہ سے لے کر مہرِ درخشاں تک اس کے تصرّف میں ہوتے ہیں۔ وہ سب سے آنکھیں چار کرتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں پیش نظر مجموعہ کے مشمولات کو اس پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے بھی کہ ان تحریروں میں نہ منطقیانہ مباحث ہیں، نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں، نہ منشور پند ناصح اور نہ خطیبانہ گھن گرج، بس روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل و معاملات سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کو بڑے سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے انداز و اسلوب میں کاغذی

پیرہن عطا کر دیا گیا ہے۔ زبان بے حد شگفتہ و شاداب ہے اور پیرایہ اتنا لطیف و پاکیزہ کہ محسوس ہوتا ہے کہ گلشنِ کشمیر کے خوش گوار اور مشک بار جھونکے ذہن و دل کو کیف و مستی سے ہم کنار کر رہے ہیں۔

پروازِ خیال میں باون عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت بڑی زندگی آسوز اور زندگی آمیز باتیں کہی گئی ہیں۔ ان سب کا مفصل جائزہ اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ مَیں صرف دو تین مثالیں پیش کروں گا۔ تاکہ آپ نمونے دیکھ کر ڈھیر اندازہ کر سکیں۔ 'ترقی یا ترقی معکوس' کے عنوان سے یہ عبارت ملی ہے:

''مالک کونین صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی چٹائی پر سوتے، بیٹھتے، تو جسمِ ناز پر نشان پڑ جاتے۔ آج! تم قالین پر چلتے ہو، جوتے چپل، بوٹ پہن کر، دفتروں، چیمبروں، آفسوں میں، غیر دینی تقریبوں میں اور عالی شان محلوں، پُر تکلف بنگلوں میں، غور کرو!
تو کیا یہ اسراف، فضول خرچی نہیں، کیا یہ ترقی ہے؟ یا ترقی معکوس''؟؟ (ص:۲۱)

''خیر کی دعوت دینے والے حرص میں مبتلا ہیں۔ لباس اُن کے اجلے ہیں، صورت بھولی ہیں اور چہرہ مقدس میں ڈوبا ہوا ...... مگر ...... آواز تو دیتے ہیں، محبت کی، اخلاص کی، تقرب الی اللہ کی، عملِ جہاد کی اور جب وقت آن پڑتا ہے، تو وہ منہ چھپا لیتے ہیں، ریت میں شتر مرغ کی طرح۔
الٰہی! ...... یہ ہیں تیرے پاسبانِ حرم۔'' (شتر مرغ کی طرح، ص:۲۵)

''تم نے!! ہاں! تم نے!! لکیریں کھینچ دیں، دیواریں اُٹھا دیں، خیمے کھڑے کردیے، زبان کی، زمین کی، جغرافیہ کی، مسلک کی، مشرب کی، مسلمانوں کو خانوں میں بانٹنے کا تمہیں کس نے دیا ہے یہ اختیار؟ اسلام نے؟ قرآن نے؟؟ احادیث نے؟؟
(جماعتِ جاہلین یا جنت الحمقاء، ص:۵۱)

ان اقتباسات پر تبصرہ طول مبحث کا باعث ہوگا۔ باشعور قارئین مصنف کے پُر خلوص جذبات و احساسات، دل سوزی و دردمندی اور اضطراب و التہاب کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ مَیں ڈاکٹر غلام جابر شمس کو ایسی خوبصورت اور فکر انگیز تحریر پر صمیمِ قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کتاب کا پر جوش خیر مقدم ہو۔

****

رضا نامے

○ شاہ محمد فصیح الدین نظامی، مہتمم کتب خانہ جامعہ نظامیہ (اے پی)

تحریک فکر رضا کے سہ ماہی ترجمانی " افکار رضا" کے مختلف شمارے نظرنواز ہوئے فکر رضا کی نئی جہات سے مطالعہ آپ کی فکر رسا کا غماز ہے۔ تغیر پذیر دنیا میں وسائل کم اور مسائل کا ایک انبار ہے شاید اسی سبب افکار رضا کی مسدودی کا اعلان کرنا پڑا۔

جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء کے شمارہ میں جناب محمد توفیق احمد نعیمی صاحب کی تحقیق و پیشکش "اعلیٰ حضرت پر کتابیں" کے زیر عنوان صفحہ ۶۱ پر تعارف کتب کے تسلسل میں فقرہ ۷ کے تحت جمعہ کی اذانِ ثانی سے اختلاف کرنے والوں میں ایک نام مولانا انوار اللہ حیدر آبادی کا تذکرہ ہے "القول الازہر" نامی رسالہ کا ردّ میں تحریر کرنا اور اس کے جواب میں شہزادۂ اعلیٰ حضرت کا "اجلی انوار الرضا" کے ذریعہ اعلیحضرت کے ارشادات کی تائید فرمانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس تحریر میں دو اہم نکات انتہائی غلطی پر مبنی ہیں جن کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔ (۱) حضرت شیخ الاسلام امام محمد انوار فاروقی نوراللہ مرقدہ نے اس نام کا کوئی رسالہ تصنیف نہیں فرمایا آپ کی طرف اس کا انتساب کسی بھی صورت میں صحیح نہیں۔

(۲) اذانِ ثانی کے مسئلہ میں "القول الاظہر فیما متعلق بالاذان عند المنبر" کے نام سے یہ رسالہ علامہ مولانا محمد معین الدین اجمیری سابق صدر مدرس مدرسۂ معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف نے ۱۳۶۹ھ میں تحریر فرمایا تھا جو عزت مآب امیر کبیر نواب ظہیر یار جنگ بہادر صدر نشین مجلس اشاعۃ العلوم کے حسب الحکم اور حکیم غلام کے اہتمام سے معین دکن پریس حیدر آباد میں شائع ہوا۔ (سرورق کا زیراکس ملاحظہ ہو) یہ ضرور ہے کہ اذانِ ثانی کے مسئلہ پر امام محمد انوار اللہ فاروقی نور اللہ مرقدہ و اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کے مابین انتہائی سنجیدہ و علمی مراسلت ہوئی جس کو مولانا محمود احمد قادری نے "مکتوباتِ امام احمد رضا" میں شائع کیا۔ فقہ کی کتابوں خلافا لابی خلیفہ، خلافالشافعی، والحنابلہ، والمالکیہ سے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ یہ عقاید کا نہیں بلکہ مسائل کا علمی اختلاف ہے جیسا کہ خصوصی شمارے کے لیے ایک عنوان "رضا بریلوی کی تحقیقات اور جزئیات اسلاف سے اختلاف" کا مطلب اس کی نوعیت خالص علمی و تحقیقی ہوگی نہ کہ ذاتی شخصی محاذی۔ امید کہ اس غلط فہمی کا ازالہ افکارِ رضا کے صفحات پر ہو جائے گا۔

○ محمد صادق رضا مصباحی، شعبۂ تصنیف و تالیف، المجمع الاسلامی، مبارک پور

سہ ماہی "افکار رضا" ممبئی کا تازہ شمارہ ہم دست ہے۔ اس کے سرورق بکس میں اس بار جن کے نظریات کو جگہ دی گئی ہے وہ دیوبندی مذہب کی عالمی تنظیم مجلس تحفظِ ختم نبوت کے ایک فرد محمد متین خالد

صاحب ہیں، تحفظِ ختمِ نبوت کے نام سے ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ پوری دیوبندی برادری برسوں سے ختمِ نبوت کا انکار کرتی آرہی ہے مگر یہ تحفظِ ختمِ نبوت کے قائل کیسے ہوگئے۔ اس سے تو دیوبندی مذہب کی بنیادیں متزلزل ہورہی ہیں، خدا ان کو سمجھ دے۔ ...... افکارِ رضا نے ایک اچھی روایت کی انگلی پکڑ رکھی ہے کہ وہ امام احمد رضا بریلوی کے حوالے سے سرکردہ مسلکی حلیفوں اور حریفوں کے نقطہائے نظر کو اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ امام احمد رضا کی ہمہ پہلو شخصیت کو متعارف کرانے میں یہ بھی ایک اچھا اقدام ہے۔ اس شمارے کے مطالعاتی سفر کے آغاز ہی میں محمد میکائیل ضیائی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے دو نعت پاک قارئینِ افکار رضا کے حوالے کی ہے۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ضیائی صاحب طویل شعری تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے احساسات اور خیالات کی مٹی کو فن شاعری کی چاک کر پرکھ کر اسے تراشنے کا گُر اچھی طرح جانتے ہیں لیکن یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ میرے ان ریمارکس کا مرجع میری شعری وابستگی اور فنی دلچسپی قطعاً نہیں ہے بلکہ ان دونوں نعتوں کے پیکروں کا شفاف لباس واضح حلیہ اور خوب صورت اور من موہنی چال ڈھال کو دیکھ کر مَیں نے یہ نظریہ متعین کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مَیں شاعری کے ابجد سے بھی نا آشنا ہوں۔ بہرحال ذاتی طور پر مجھے یہ اشعار اچھے لگے۔

زبیر قادری صاحب نے اس مرتبہ افکار رضا میں ایک نئی چیز پیش کی ہے۔ مذہبی پرچوں میں اپنی نوعیت کی یہ الگ تخلیق مجھے آج تک دیکھنے کو نہ ملی ''تم بھی قاتل ہو'' کے عنوان سے محمد اسماعیل صدیقی صاحب نے اپنی نوعیت کے منفرد اظہاریہ سے دنیا میں ہورہے ظلم وستم پر ایک پُرزور قلمی احتجاج کیا ہے اور مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑنے کی بامعنی کوشش کی ہے۔ شاید اس لیے انہوں نے خاموش تماشائیوں کو بھی ''تم بھی قاتل'' کہہ کر پکارا ہے۔ اتنی عمدہ اور انوکھی تخلیق پر ہم اسماعیل صاحب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

عظیم آباد (پٹنہ) کے کوئی انوار محمد صاحب ہیں جنھوں نے ''امام احمد رضا بریلوی کے حدیثی شروح و حواشی کے چند عکسی صفحات کا مختصر مطالعہ وعلمی تجزیہ'' پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے تجس وتفحص کے کئی منازل عبور کیے ہوں گے۔ ان کی یہ کاوش بڑی ہی تحقیقی ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے۔ اتنے عمدہ تحقیقی مضمون پر ہم انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور یہ اُمید کرتے ہیں کہ ان کا تحقیقی خامہ برابر چلتا رہے گا اور نئے نئے خزاں رسیدہ نادر موضوعات کی وادیوں کو زرخیز بناتا رہے گا۔

علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ کے افادات واقعی بڑے افادی ہوتے ہیں خصوصاً عوامی اذہان کو چھوکر گزرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ محترم خلیل رانا صاحب نے زیرِ نظر شمارے میں فلسفۂ نماز کے سلسلہ میں کاظمی صاحب علیہ الرحمہ کے افادات کا حسین گلدستہ پیش کیا ہے۔ اسے مطالعے کی میز پر سجایا جانا چاہیے۔ لائق تہنیت ہیں رانا صاحب کہ اس طرح کے افادات پیش کرکے قارئینِ افکار رضا کے ذوق کی ضیافت کرتے ہیں۔

''کیا ماہِ صفر نزولِ آفات کا مہینہ ہے؟'' اس سلسلہ میں محمد شہزاد مجددی صاحب کی تحریر بہت بہتر ہے۔ موصوف نے احادیثِ کریمہ اور اقوالِ ائمہ کا سہارا لے کر اس جاہلی فکر کی لَے کو بند کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مضمون کی وقعت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے معروضات کو جگہ جگہ قابلِ استناد حوالوں کا آئینہ دکھایا ہے مگر پھر بھی یہ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ حوالہ ایک دم مکمل ہونا چاہیے تا کہ کسی بھی قاری کو الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ بہارِ شریعت کا حوالہ تلاش کرنے میں ہمیں دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے جب کہ اس کا اصلی حوالہ جلد چہارم ص ۲۰۷ ہے۔

شریف رضا عطاری صاحب ایسے مضمون نگار ہیں جن کے قلم کے احساسات افکارِ رضا کے لیے کبھی ٹھنڈے نہیں ہوتے۔ وہ بڑی دور سے چل کر تقریباً ہر شمارے کی محفل میں تشریف لاتے ہیں۔ باخدا یہ مضحکہ خیزی نہیں بلکہ خوش بختی اور مبارک بادی کی بات ہے کہ ان کے فکر وقلم کے دل پر ''افکارِ رضا'' کا نام نقش ہو چکا ہے۔ اس شمارہ میں انہوں نے ''انٹرنیٹ اور ایک علمی درس گاہ کا تصور'' پیش کیا ہے۔ یہ تحریر ہم جیسے طالب علموں کے لیے تو ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ یقیناً اگر ان کے مطالبات کو عمل کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو بین الاقوامی دعوتی مارکیٹ میں ہمارے تعلیمی اور تبلیغی نرخ کا اضافہ ہوجائے گا اور ہماری دعوتی کوششوں کی آوازیں بھی دھیان سے سُنی جائیں گی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقاید اور خارجی مطالعے کے لیے شایقین و محققین کو انہوں نے جن سائٹس کا تعارف کرایا ہے اور ان میں ڈاؤن لوڈ (Download) کتابوں کے اسما تحریر کیے ہیں۔ اس سیاق میں بلاشبہ ان سائٹس کی حیثیت ماخذ و مراجع کی ہوچکی ہے۔ اس کے لیے ہم عطاری صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان سے عرض کناں ہیں کہ اس طرح کے اور بھی اسلامی موضوعات کے حوالے سے مستند سائٹس کے بارے میں آگاہ فرمائیں اور اس کو کتابی شکل میں زیادہ سے زیادہ شائع کریں۔ اس سے علمی موضوعات سے ذوق رکھنے والوں کی ذہنی وادیاں معطر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گی۔ اگر انہیں ہماری معروضات سے اتفاق ہے تو پھر انہیں پیشگی مبارک باد لیکن ان کو الوداعیہ دینے سے پیشتر گزارش کرتے ہیں کہ اب اپنی جماعت کا مرثیہ پڑھنا بند کر دیجیے۔ اپنے مضمون کے دوسرے ہی صفحہ پر آپ نے مخالف جماعتوں کی دعوتی بیداری اور اپنی جماعت کی غفلت اور خاموشی کے بارے میں جو رثائی جملے تحریر کیے ہیں وہ لکھنے کے نہیں بلکہ محسوس کرنے اور عمل کرنے کے ہیں۔ اس قسم کی کمیوں کو دور کرنا ہم سب کا فریضہ ہے نہ کہ دوسروں کو موردِ الزام گردان کر خود کو کنارے کر لیا جائے۔ یہ روش بہت پرانی ہوچکی ہے، اب اسے سرد خانے میں ڈالنے کی ضرورت ہے۔

جناب محمد اسلم صاحب نے جناب محمد فاضل دیوبندی تحریر کا دندان شکن جواب دیا ہے اور ''استمداد باولیا اللہ'' کو تحقیق و تجزیہ کی روشنی میں ثابت فرمایا ہے۔ یہ مدلل تحریر خوب ہے اور معلومات کے چراغوں کو

خوب روشن کر دیتی ہے لیکن یہاں بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حوالہ مکمل ہونا چاہیے۔ ایک مقام پر کمپوز کی ہلکی سی چوک سے "ابین من الامس" کے بجائے "ابین الامس" راہ پا گیا ہے۔ بہجۃ الاسرار شریف کا متعلقہ حوالہ ہم نے کھول کر دیکھا تو ہم محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اس عبارت "جب تم کسی حاجت کا اللہ سے سوال کرو تو میرے وسیلے سے مانگو" کا عربی متن متعلقہ مقام پر تو دور کی بات ہے چند سطور کے احاطے میں سیاق و سباق تک میں بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں اس میں ہماری کمزور نگاہوں کا کمال ہے یا فاضل مضمون نگار کے قلم کا، یہ فیصلہ خود انہی کی عدالت میں چھوڑتے ہیں۔

"مرید اعلیٰ حضرت مفتی محمد اجمل شاہ سنبھلی: حیات اور علمی کارنامے" کے احوال سُناتی جناب غلام مصطفیٰ قادری صاحب کی تحریر ہمیں بتاتی ہے کہ اپنے اسلاف کی حیات اور ان کے علمی کارناموں کو یاد رکھنا اور اسے دوسروں تک منتقل کرنا ایک سچے مومن کی شان ہے۔ اس جہت سے قادری صاحب کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے۔

خلیفۂ مفتی اعظم ہند مولانا عبدالغنی نصیر آبادی علیہ الرحمہ کے احوال و کوائف بھی جناب کلیم احمد قادری صاحب سے ہمیں پڑھنے کو ملے۔ خلیفۂ مفتی اعظم ہند کا شخصی تعارف کرانے پر ہم تمام قارئین کے ساتھ اُن کے شکر گزار ہیں۔

شیش گڑھ بریلی کے مولانا محمد توفیق احمد نعیمی مذہبی تصنیفی حلقے کے ایک فرد شمار کیے جانے لگے ہیں۔ ان کی کئی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں "مفتاح العربیہ" حصہ اوّل دوّم عربی ادب کے موضوع پر سرفہرست ہے اور داخلِ درس کیے جانے کے لائق۔ زیر نظر مقالہ "اعلیٰ حضرت پر کتابیں" جو غالباً ایک کتاب کی شکل میں ہے ۵۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس شمارہ کی جان قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک اس کی ہئیت کذائی کتاب کی سی ہے۔ حرفِ آغاز ایک صفحہ کا ہے جس میں مصنف یعنی مضمون نگار نے مولانا ہاشم صاحب نعیمی اشرفی کو پروفیسر معقولات و منقولات کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس سے پہلے بہت سارے لوگوں کی زبانی ہم موصوف کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا سابقہ سن چکے ہیں۔ اگر ہم معنی خیز نظروں کے شکار نہ ہوں تو ہمیں یہ عرض کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ کسی دینی ادارے کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدرّس کو بھی پروفیسر کہنے کا حق کب، کس نے اور کیوں دیا۔ گو اس کی صلاحیتوں کی سرحدیں کسی پروفیسر کی صلاحیتوں کے حدود سے کئی گنا آگے نکل چکی ہوں۔ لیکن اس کو پروفیسر کہنا کس کا 'فتویٰ' ہے؟ اسے پڑھ کر یونیورسٹیوں کے حقیقی پروفیسران کیا تاثر لیں گے۔ کیا اس سے ہماری مضحکہ خیزی کے دروازے نہیں کھلتے؟ بہرحال مولانا توفیق صاحب کی یہ تحقیقی کاوش سراہے جانے کے قابل ہے۔ اس کے لیے وہ بالعموم سُنّی دنیا اور بالخصوص رضوی دنیا کی جانب سے تہنیتوں کی سوغات پیش کیے جانے کے لائق ہیں۔ انہوں نے اس مقالہ میں ۱۹۲۱ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک اعلیٰ حضرت پر لکھی ہوئی کتابوں کی فہرست اور ان کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ تحقیق و جستجو کے اس

سفر میں نہ جانے کتنی اذیتیں ان کے ہم رکاب رہی ہوں گی لیکن اپنے موضوع کے منزل کا پتھر انہوں نے چوم کر ہی چھوڑا۔ اس لیے ایک بار پھر سے ان کی شکر گزاری کا موقع دیا جائے۔ اس مبسوط مقالے میں ان کا تحقیقی خامہ اردو کے ایک محاورے سے الجھ گیا ہے اور ''عش عش کر اُٹھے'' کے بجائے ''عش عش کہہ اُٹھے'' اس کی زبان سے ادا ہو گیا ہے۔ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جانی چاہیے۔

''تبصرۂ کتب'' میں اس بار مولانا ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی کتاب ''کلیات مکاتیب رضا'' شامل ہے اور مبصر بھی کوئی ایسے ویسے نہیں مولانا سید رکن الدین اصدق مصباحی صاحب ہیں، یہ تبصرہ لائق مطالعہ ہے اور بہت سے حقائق کے در وا کرتا ہے۔

''رضا نامے'' کے کالم میں یہ حقیر محمد صادق رضا مصباحی پھر حاضر خدمت ہے۔ اپنے اس تبصرہ کے بارے میں بلکہ دوسرے تمام تبصروں کے بارے میں بھی ہم افکار رضا کے قارئین سے اپیل کرتے ہیں کہ ہماری قلمی، لسانی، ادبی اور کسی بھی طرح کی خامیوں کی نشاندہی فرما دیا کریں ہم ان کے شکر گزار رہیں گے۔

آخری صفحہ پر ''افکارِ رضا'' کے خصوصی شمارے کے لیے ''منتخب عناوین'' کی فہرست ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت کے لیے ہم زبیر قادری صاحب اور ان کے عملے کو پیشگی مبارکباد دیتے۔ ان شاء اللہ یہ خصوصی شمارہ مجموعی طور پر پچاسواں شمارہ اور اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء کا شمارہ ہوگا۔

اس صفحے کی آخری سطر ''نوٹ: افکارِ رضا کا یہ آخری شمارہ ہوگا اس کے بعد افکار رضا بند کر دیا جائے گا'' پر جیسے ہی ہماری نظر آ کر رکی ہم حیرتوں کے گرداب میں پھنستے چلے گئے۔ اپنی عمر کے تیرہویں سال میں قدم رکھنے کے باوجود آخر کن وجوہات کی بنا پر محترم زبیر قادری صاحب نے افکارِ رضا بند کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس کے تجسس میں جب ہم نے اپنی فکر کے گھوڑے دوڑائے تو ہماری عقل اندیش نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید افکار رضا بھی قلمی اور مالی تعاون کے عدم فراہمی کے راستے پر پہنچ چکا ہے جس کی وجہ سے زبیر قادری صاحب کو اپنے قدم پیچھے کھینچ لینے پڑے اور تاریخ کا ایک باب بند کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ ہم پوچھتے ہیں کیا یہ پوری جماعت کے لیے گہرے صدمے کی بات نہیں ہے؟ فکرِ رضا کے حوالے سے ''افکارِ رضا'' علمی حلقوں میں اپنی ایک مضبوط اور نمایاں پہچان بنا چکا ہے۔ ہندستان میں فکرِ رضا کی بھرپور نمائندگی کرنے اور رضویات کی ترسیل کا یہ واحد جریدہ ہے۔ اس حوالے سے اس کا حلقہ نہایت وسعت اختیار کر چکا ہے۔ اس حقیقی منظر نامہ کی زمین میں اس کی جڑیں مضبوط ہونے کے باوصف اس کی سانسیں اکھڑنا تحیر خیز بھی ہے اور باعثِ افسوس بھی۔

کہاں ہیں ملی درد مندوں اور مذہبی قایدوں کی جماعتیں جو قدم قدم پر مسلکِ اعلیٰ حضرت کا نعرہ لگاتی ہیں اور مسلکی خیر خواہی کے لمبے لمبے بیانات اُن کی زبانِ اقدس سے جاری ہوتے ہیں، اپنے مسلکی فکر کے ترجمان کی ناگفتہ بہ حالت پر ان کی عقیدتوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ کیا وہ مالی اور قلمی تعاون فرما کر

اس کے لیے آبِ حیات کا انتظام نہیں کر سکتے؟ خدارا جلدی کیجیے ورنہ تاریخ کی مرقد میں پہنچنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یاد رکھیے کہ اگر افکارِ رضا بند ہوگیا تو ایک فکر پر ضرب پڑے گی، ایک تحریک پر آنچ آئے گی، ایک تنظیم کے تار و پود بکھریں گے۔

محترم زبیر قادری صاحب اور اُن کا پورا عملہ صد ہزار تہنیتوں کا بجا طور پر استحقاق رکھتا ہے کہ مکمل بارہ سال تک انہوں نے افکارِ رضا کو بڑی خوش اسلوبی سے زندہ رکھا۔ اسے زندگی عطا کرنے میں حتی المقدور کوتاہی نہیں برتی۔ یہ قلمی تعاون کے عدم فراہمی ہی کی تو بات ہے کہ انہیں رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے بعض غیر معیاری مضامین بھی شائع کرنا پڑے مگر پھر بھی رسالے کو اپنی بے پناہ مساعی کا خون دیتے رہے۔ لیکن اب جب وہ احساس کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں اور ان کے حوصلوں اور جذبات کا غبارہ پھوٹنے کے قریب ہے تو تصور کیجیے کیا ان کی امیدوں کا لاشہ بے گور و کفن نہیں پڑا ہوگا؟ ان کے تصورات کے بت پاش پاش نہیں ہو رہے ہوں گے؟ ان کی تمنائیں چراغ سحری نہیں بن رہی ہوں گی؟ لہٰذا مسلکِ اعلیٰ حضرت کے ماننے والوں سے پُرخلوص گزارش کی جاتی ہے کہ افکارِ رضا کے چراغ کو گل ہونے سے بچائیں۔ کاش مزارِ اعلیٰ حضرت کی چادروں کی ایک سال کی قیمت بھی اگر افکارِ رضا کے حوالے کردی جائے تو افکارِ رضا کے کمزور بازو مضبوط ہوجائیں۔

○ **سلیمان سبحانی**، اسپین SulemanSubhani@yahoo.Com

میرا تعلق بارسلونا اسپین سے ہے۔ بارسلونا میں پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کی کافی زیادہ تعداد ہونے کے باوجود کوئی اپنی مسجد نہیں تھی۔ پر الحمدللہ ساتھیوں کی محنت سے گذشتہ سال اہلسنت (حنفی) کی پہلی مسجد معرضِ وجود میں آئی اور ساتھ ہی علمائے اہلسنت کا خصوصی دستِ شفقت رہا اور پیر طریقت رہبر شریعت حضرت علامہ مولانا سید شاہ تراب الحق قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے خصوصی کرم فرماتے ہوئے بارسلونا میں اہلسنت کی پہلی مسجد غلامانِ مصطفیٰ ﷺ میں پہلی عظیم الشان عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ ان شاء اللہ اس سال بھی 23 رمئی 2007ء کو مسجد غلامانِ مصطفیٰ ﷺ میں دوسری عظیم الشان عظمتِ مصطفیٰ ﷺ منعقد ہونی ہے۔

اسی طرح ایک ماہ قبل ہی دعوتِ اسلامی کے بھائیوں کی انتھک کوششوں اور محنت اور تقریباً ایک سال کے طویل انتظار کے بعد اللہ رب العزت اور آقا کریم ﷺ نے کرم کیا اور "فیضانِ مدینہ" بارسلونا کی اجازت مل گئی۔ اُس سے قبل دعوت اسلامی کے اجتماعات ساتھیوں کے گھروں میں ہوتے تھے۔ اب الحمدللہ فیضانِ مدینہ مسجد میں ہر ہفتہ کو بعد نمازِ ظہر تقریباً 3 بجے دن اسلامی بہنوں کے لیے سنتوں بھرا اجتماع ہوتا ہے اور ہر اتوار کو بعد نمازِ عصر اسلامی بھائیوں کا سنتوں بھرا اجتماع ہوتا ہے۔ روزانہ بعد نمازِ عصر مدنی منوں اور منیوں کے

لیے مدرسۃ المدینہ، فیضانِ مدینہ بارسلونا میں لگتا ہے اور بالغوں کے لیے روزانہ مغرب کے بعد مدرسۃ المدینہ لگتا ہے۔ یہاں مزید کوششیں کی جارہی ہیں کہ کسی طرح اپنی ذاتی جگہ پر مسجد بنائی جائے کیونکہ ابھی تک جتنی مساجد ہیں وہ تقریباً کرائے کی جگہوں پر ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش جاری ہے کہ بارسلونا میں کم از کم 10 مساجد تو اپنی ہونی ہی چاہئیں۔

اس کے علاوہ ویلنسیا بھی اسپین کا ایک شہر ہے۔ وہاں قبلہ شاہ تراب الحق قادری صاحب کے مرید صوفی منیر صاحب ہوتے ہیں جو وہاں کی مسجد فیضانِ مدینہ، ویلنسیا کے امام وخطیب بھی ہیں۔ فیضانِ مدینہ ویلنسیا تقریباً ۴-۵ سال سے مسلکِ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ بس کمی ہے تو آپس میں روابط میں کمی ہے ہر کوئی اپنے کاموں میں مصروف ہے۔

میڈرڈ میں بھی پہلی مسجد اہلسنت پاکستانیوں کی معرض وجود میں آئی ہے۔ اسی طرح دیگر کئی شہر ہیں جہاں کام کی سخت ضرورت ہے۔ لگرونیا، بادالونا، بسوس مار، فوندو وغیرہ جہاں کم از کم ایک مسجد ہونی چاہیے پر ابھی تک کوئی نہیں ہوسکا ہے۔ تمام ساتھیوں سے گزارش ہے وہ دعا کریں کہ اللہ پاک اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے وطفیل اسپین کی سرزمین پر ایک بار پھر اسلام کا جھنڈا بلند ہو جائے آمین۔

یہاں اسپین میں ویسے تو مراکش کے عربی حضرات کی تعداد کافی ہیں جو فقہ کے لحاظ سے تو الگ ہیں پر الحمدللہ پکے سُنّی ہیں۔ اکثر مقامات پر یہ مسئلہ ہے کہ ان کے امام صاحبان کی داڑھی نہیں ہوتی پر یہ ان میں اکثریت عقاید کے لحاظ سے پکے سُنّی اور یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند کرنے والے ہیں۔ فقیر جب پہلی بار اسپین آیا تھا جس علاقہ میں تھا وہاں بھی مراکش کے عربوں کی مسجد تھی۔ جہاں ہر ہفتے بعد از عشاء محفلِ نعت کی طرز پر محفل ہوتی ہے جس میں حمد ونعت اور کچھ دیر تقریر پھر باقی ساری رات ذکر بالجہر کیا جاتا تھا۔ اکثر صدائیں بھی لگاتے یا نبی سلام علیک ۔۔۔ اس کے علاوہ یہاں اسپین میں بستر لوٹا پارٹی (تبلیغی (شیطانی) جماعت) نے بھی کام کا آغاز کردیا ہے اور افسوس کہ بارسلونا میں دو قدیم پاکستانیوں کی مساجد پر ان کا قبضہ ہے۔

یہاں گمراہ سُنّیوں (منہاج القرآن) والوں کا بھی کام چل رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی سُنّی تنظیم نہیں تھی۔ اب ان شاء اللہ سُنّی صحیح العقیدہ تنظیموں نے تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کردیا ہے اس لیے مستقبل میں بہتری کی امید ہے۔ یہاں تربیت یافتہ سُنّیوں کی کافی ضرورت ہے خاص کر کوئی مفتی آجائے تو اسپین والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوجائے۔ سُنّی علما سے بھی گزارش ہے کہ جہاں وہ لندن و دیگر یورپ ممالک کے دورے کرتے ہیں تھوڑی سی عنایت اسپین والوں پر بھی کردیں تو ان شاء اللہ کافی بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

○ **مولانا مبین الہدیٰ نوری مصباحی**، مدرسہ گلشنِ حسین، جواہر نگر، جمشید پور

غزالیِ زماں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ نے کسی موقع پر خانیوال (پاکستان) میں ''مقامِ امامِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کے عنوان پر ایک تقریر فرمائی تھی۔ جو افکارِ رضا ممبئی از ص ۱۵ تا ۲۷ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس کے مرتب محمد اسلم الوری صاحب اور محشی صدیق فانی صاحب ہیں۔ ایک دن اس کا بغور مطالعہ کیا تو طبیعت جھوم اُٹھی۔ لیکن مضمون میں ایک مقام پر ایسی زبردست غلطی نظر آئی کہ پناہِ بخدا۔ اس کی تصحیح ازحد ضروری ہے۔ علامہ کاظمی صاحب سے ایسی فحش اور قابلِ گرفت غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مضمون کے صفحہ ۲۳ پر شائع ہوگیا ہے کہ ''یہ (حنفی) سوادِ اعظم ہیں۔'' جو قطعاً غلط ہیں۔ کیونکہ سوادِ اعظم میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی سب ہی شامل ہیں۔ اصل عبارت یوں ہونا چاہیے'' یہ (حنفی) سوادِ اعظم سے ہیں''۔ تمام قارئین حضرات اپنی کاپیوں میں تصحیح فرمالیں۔

○ **م لئیق انصاری**، رائے بریلی

''افکارِ رضا'' کی اشاعت بند کرنے کی افسوس ناک خبر پڑھ کر ذہن و دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ سہ ماہی ''افکارِ رضا'' ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایمان و یقین کا وہ چراغ تھا جس کی روشنی میں اہلِ ایمان و یقین منزلِ عرفان حاصل کرلیا کرتے تھے۔ ''افکارِ رضا'' گلستانِ اعلیٰ حضرت کا وہ گلِ تازہ تھا جس کی نکہت ہندستان کی سرحدوں کو عبور کر کے برصغیر کے تمام خطوں میں پہنچ گئی تھی۔ مگر آہ! خواب چکنا چور ہوگئے۔ زبانیں گنگ اور آنکھیں بے نور ہونے کی اندوہناک خبر کو کیونکر برداشت کروں ....؟

ایک کے بعد ایک چراغ بجھتے جارہے ہیں۔ عقیدت و محبت کے گھنیرے شجر گرتے جارہے ہیں۔ عقایدِ اعلیٰ حضرت کے آئینے بے نور ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف ہماری بے حسی اور جماعت کی غیر سنجیدگی ہے۔ کیا خانقاہیں اس سے نابلد ہیں۔ کیا مدارس ان وجوہات سے ناواقف ہیں۔ کیا علما، مشائخ اور جماعت کے نمایندے اور سرکردہ شخصیات ان حالات سے بے خبر ہیں ......؟ نہیں قطعی نہیں۔ کیونکہ آج سُنّیت ایک خوب صورت ''سائن بورڈ'' بن کر رہ گئی ہے۔ افکارِ رضا کی اہمیت اور اعلیٰ حضرت کی محبت صرف نعرہ بن کر رہ گئی ہے۔ کیا جماعتِ اہلِ سُنّت کو ٹکڑوں میں بانٹنے والے اس حقیقت سے ناآشنا ہیں..........؟؟؟ رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

○ **محمد معین الدین رضوی**، فرینڈس فٹ ویر، چترادرگہ، کرناٹک

تصانیف اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کی نمائش

مرکزِ اہلِ سُنّت سلطانی جامع مسجد (تعمیر کردہ حضرت ٹیپو سلطان شہید علیہ الرحمہ) و جامعہ اہلِ سُنّت حضرت ٹیپو سلطان شہید و نوجوانانِ اہلِ سُنّت چترادرگہ، کرناٹک کے زیرِ اہتمام مورخہ ۱۵۔۱۶ مارچ ۲۰۰۷ء

مطابق ۲۴-۲۵ صفر المظفر ۱۴۲۸ھ بروز جمعرات و جمعہ **کتبِ اعلیٰ حضرت کی نمائش منعقد** ہونے کا اعلان بذریعہ اشتہار اور مراسلات کے ذریعے کیا گیا۔ یہ خبر عوام کے لیے باعثِ مسرت ہوئی۔ چتر ادرگہ کے ایک وسیع و عریض میدان میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کی تعمیر کردہ عالی شان تاریخی مسجد مرکز اہل سنت کی حسین عمارت کے قریب میں جامعہ اہل سنت حضرت ٹیپو سلطان شہید عرصہ دراز سے قائم ہے۔ اسی جامعہ کی جدید عمارت کے ایک بڑے ہال میں جامعہ کے مہتمم جناب حافظ و قاری محمد عظمت اللہ صاحب امجدی کی قیادت میں کتبِ اعلیٰ حضرت کی نمائش کا دو ۲ روزہ پروگرام رکھا گیا۔ ہال میں ہر چہار جانب سرکار اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی وہ کتابیں اور رسالے جو شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں، ٹیبلوں پر اس طرح رکھی گئی تھیں کہ ہر جلد کا سرورق نمایاں نظر آرہا تھا۔ عاشقانِ اعلیٰ حضرت سیکڑوں کی تعداد میں تصنیفاتِ اعلیٰ حضرت کے ذریعہ اعلیٰ حضرت کی خدمات و حیات کے مختلف گوشوں پر مطالعہ و مشاہدہ فرما رہے تھے۔ دیواروں پر اعلیٰ حضرت کی شان میں مختلف حضرات کے مضامین جو قریباً 150 کے قریب تھے بڑے سائز میں (enlarge) اور لیمی نیشن (lamination) کے ساتھ لگائے گئے تھے۔ شرکا کی کیفیت یہ تھی کہ صبح سے شام تک موجود رہ کر اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے سرورق کو دیکھ کر دل کی زبان سے یہ کہتے رہے۔

مخزنِ علم و حکمت ہیں احمد رضا معدنِ خیر و برکت ہیں احمد رضا
قائدِ اہل سنت ہیں احمد رضا ان کے در پہ جو آئے سنبھل جائے گا

جن اداروں نے اس نمائش میں تعاون کیے تھے اُن کے نام کے بیانر دیوار پر لگائے گئے تھے۔ جن کے نام اس طرح ہیں۔ تحریک فکر رضا ممبئی، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کشمیر، نوری مشن مالیگاؤں، رضا اسلامک اکیڈمی بریلی شریف، مرکز اہل سنت برکاتِ رضا پور بندر، رضا اکیڈمی ممبئی، قادریہ رضوی ایجوکیشنل سوسائٹی چترادرگہ، قادریہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اَدونی (A.P)۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی تحریکوں کی جانب سے بڑے بڑے بینرس لگے ہوئے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ تصنیفاتِ اعلیٰ حضرت کی اس نمائش کا کو خوب پذیرائی مل رہی ہے۔ پروگرام کا اختتام فاتحہ خوانی و ایصال ثواب پر ہوا پھر منتظمین نے مجھے بتایا کہ یہ نمائش کا دوسرا سال تھا اور عاشقانِ اعلیٰ حضرت و قوم ملت کی دعا رہی تو سرکار اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر ہر سال اس نمائش کا اہتمام ہوتا رہے گا۔ جب میں واپس ہونے لاگا تو خود بخود یہ شعر زبان پر آگیا۔

اوروں نے بھی لکھا ہے بہت علمِ دین پر جو کچھ ہے اس صدی میں ہے وہ تنہا رضا کا ہے

(نوٹ:) دو سالہ نمائش کی وڈیو سی ڈی (video cd) نکالی گئی ہے جس میں کسی جاندار کی تصاویر نہیں ہیں۔ خواہش مند حضرات درج بالا پتہ پر رابطہ قائم کریں۔

اخبارِ رضا

☆ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا نے سالانہ امام احمد رضا کے موقع پر مندرجہ ذیل کتب شائع کیں۔ (۱) سال نامہ ''معارفِ رضا'' (اردو/ عربی/ انگریزی۔ علیحدہ علیحدہ) (۲) امام احمد رضا کی انشا پردازی کی خصوصیات، از: ڈاکٹر غلام غوث قادری (۳) اردو نعت گوئی اور فاضلِ بریلوی، از: ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (۴) امام احمد رضا اور علمائے کوٹلی لوہاراں، از: پروفیسر مجیب احمد (۵) کنزالایمان اور دیگر تراجمِ قرآن، از: ڈاکٹر مجید اللہ قادری (۶) امام احمد رضا کے تعلیمی نظریات، از: سلیم اللہ جندراں (۷) امام احمد رضا بریلوی کے حالات (سندھی)، از: پروفیسر عبدالباری صدیقی (۸) مجلّہ امام احمد رضا کانفرنس ۲۰۰۷ء (۹) قرآن اور سائنس (انگریزی)، از: ڈاکٹر مجید اللہ قادری۔ ☆ شرح حدائق بخشش، مرتبہ مفتی غلام حسن قادری، صفحات ۱۱۰۰، قیمت ۵۰۰ روپے، مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور۔ ☆ کاروانِ نعت (نعت خوانی نمبر)، صفحات ۵۰۰، قیمت ۲۰۰ روپے، ناشر ادارہ کاروانِ نعت۔ غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ ☆ مقدماتِ رضویہ، از: علامہ عبدالحکیم شرف قادری، مرتبہ عبدالستار طاہر مسعودی، قیمت ۱۵۰، مکتبہ قادریہ، دربار مارکیٹ، لاہور۔ ☆ مقالاتِ شرف قادری، مرتبہ عبدالستار طاہر مسعودی، قیمت ۲۲۵ روپے، مکتبہ قادریہ، دربار مارکیٹ، لاہور۔ ☆ وصایا شریف اعلیٰ حضرت پر اعتراضات کے جوابات، از: علامہ حسن علی رضوی، قیمت ۲۰ روپے، ناشر انجمن انوارالقادریہ، جمشید روڈ نمبر۳، کراچی۔ ☆ حسام الحرمین کی حقانیت، از: علامہ حسن علی رضوی، ناشر انجمن انوارالقادریہ، جمشید روڈ نمبر۳، کراچی۔ ☆ چترالی زبان میں ترجمہ کنزالایمان، از: علامہ پیر محمد چشتی مہتمم جامعہ غوثیہ، یکہ توت، پشاور۔ ☆ جہانِ رضا کے اداریئے۔ فکرِ فاروقی، مرتبہ محمد عالم مختارِ حق، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر: مکتبۂ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور۔ ☆ باتوں سے خوشبو آئے، از: مولانا صلاح الدین سعیدی، قیمت ۱۵۰ روپے، ناشر: تاریخ اسلام فاؤنڈیشن، پوسٹ بکس ۲۲۰۶، پاکستان ☆ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کے زیر اہتمام ''جہانِ امام ربانی مجدد الف ثانی'' کی ۱۱ جلدیں چھپ گئی ہیں۔ قیمت: ۵۵۰۰ روپے مکمل سیٹ۔ ☆ ''مسعودِ ملّت اور امام احمد رضا'' از ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، ادارۂ مسعودیہ، کراچی نے شائع کی ہے۔ ☆ ''امام احمد رضا اور خدمات و اثرات'' مرتب: ابو زہرہ رضوی، ناشر: رضا ریسرچ اینڈ پبلشنگ بورڈ، مانچسٹر، نے شائع کر کے مفت تقسیم کی ہے۔ ملنے کا پتہ: نوری مشن، مدینہ کتاب گھر، اولڈ آگرہ روڈ، مالے گاؤں۔

عظیم آباد کے ایک معتبر علمی تحقیقی اور اشاعتی ادارہ القلم فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام رضویاتی مشن کے فروغ کے لیے
ایک تبصراتی رسالہ کا اجرا بنام

رضا بُک ریویو

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالبیات و اقبالیات کی طرح "رضویات" بھی اصحابِ فکر وفن اور اربابِ تحقیق کا پسندیدہ موضوع بن چکا ہے، جس کی معنوی وسعت میں زبان و بیان اور شعر وسخن ہی نہیں بلکہ مذہب وملت اور علوم وفنون کی ہمہ جہت تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کی یونیورسٹیز، کالجز اور بین الاقوامی سطح کی متعدد تنظیم و ادارہ جات میں اس موضوع پر مسلسل محنتوں سے ملک گیر بلکہ عالم گیر پیمانے پر قابلِ قدر کام ہورہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "رضویات" کی تفہیم اور ترسیل و ابلاغ کے سلسلہ میں یہ کوششیں سست رفتاری ہی سے سہی مگر بار آور ثابت ہورہی ہیں۔ اس سلسلہ میں رضویاتی مشن کو فروغ دینے والے متعدد رسائل بالخصوص "معارفِ رضا" کراچی، "جہانِ رضا" لاہور، "افکارِ رضا" ممبئی، "تجلیاتِ رضا" بریلی کی بھی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، تاہم رضویات کے موضوع پر عالمی سطح پر ہونے والے کام کی منضبط رپورٹ، رضویات پر شائع ہونے والی کتابوں کی قدروں کا تعین، محققینِ رضا کا تعارف، رسائل و جرائد میں رضویات پر شائع مواد کی تحقیق وترتیب وغیرہ ایسے گوشے ہیں جن پر باضابطہ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ عالمی سطح پر ہونے والے کام کا آئینہ ہمارے پیش نظر رہے۔ کام میں ضابطگی آئے اور اشتراک و تقسیم کار کے اصولوں پر رضویات کو فروغ دینے کے مواقع حاصل ہوسکیں۔

انہی تقاضوں کے پیش نظر القلم فاؤنڈیشن پٹنہ نے "اردو بک ریویو" اور "اقبال بک ریویو" کی طرز پر "رضا بک ریویو" رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ جس کے مجوزہ مشمولاتی عناوین حسب ذیل ہیں:

☆ اداریہ ☆ مقالات ☆ تبصرہ وتنقید (تازہ کتابوں پر ناقدانہ نظر)

☆ تعارفِ کتب (تازہ کتابوں کا مختصر تعارف)

☆ رضویات پر جامعاتی اسناد (مثلاً ڈاکٹریٹ کی سند) لینے والے افراد اور دیگر شخصیات، ادارے اور تنظیموں کا تعارف ☆ تاریخی مساجد و مدارس اور خانقاہوں کا تعارف

☆ مختلف کتب خانوں میں رضویات پر موجود کتابوں کی جامع فہرست

☆ ردِ رضویات کے اشاعتی مواد پر تنقیدی نظر

☆ رسائل و جرائد میں رضویات پر آنے والے مضامین کا اشاریہ

☆ کسی غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ (تھیس) کا تعارف و خلاصہ

☆ نصف صدی سے زاید قدیم کسی مطبوعہ کتاب پر مختصر مضمون

☆ رضویاتی خبریں ☆ انٹرویو (تحریری مصاحبہ) ☆ تاثرات

ہم تمام علم دوست، علم نواز اور "رضویات" سے مخلصانہ رشتہ رکھنے والے حضرات سے، نیز رضویات پر کتابیں شائع کرنے والے اداروں، معتبر ناشروں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ متذکرہ عنوان مشمولات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی علمی اور تحقیقی کاوشوں نیز رضویاتی خبروں سے نوازیں۔

اسلامی روحانی مشن ٹرسٹ ISLAMI ROOHANI MISSION TRUST

فیڈرل کیپٹل ایریا نمبر ۱، لیاقت آباد نمبر ۴، کراچی ۷۵۹۰۰، پاکستان

باسمہ تعالیٰ مَیں پروفیسر محمد مقصود الٰہی بن صوفی محمد سلیم صحیح العقیدہ محمدی، سُنّی، بریلوی ہوں اور شیخ محقق حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ اور اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان مجدد بریلوی علیہ الرحمہ کی تحریرات اور تعلیمات کے مطابق مسلکِ حق اہلِ سُنّت و جماعت کا پابند حامی، موئید اور مبلغ ہوں۔ اور اُن کے فتاویٰ حسام الحرمین، رد الرّفضہ کی دل و جان سے تائید و تصدیق کرتا ہوں اور ان کو آج بھی قابلِ عمل مانتا ہوں۔ علماے دیوبند رشید احمد گنگوہی، محمد قاسم نانوتوی، خلیل احمد انبیٹھوی، اشرفعلی تھانوی اور مصنف صراط مستقیم سید احمد رائے بریلوی اور اسماعیل دہلوی جن کی تکفیر اور لادینیت اور گستاخانہ عبارات پر اعلیٰ حضرت نے جو فتاویٰ دیے ہیں ان عبارات کے ہر قائل و قابل کو اسی حکم میں داخل سمجھتا ہوں جس حکم کی وضاحت اعلیٰ حضرت نے اپنے فتاویٰ میں فرمائی ہے۔ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کی خانقاہ اللہ آباد شریف کے بانی حضرت اللہ بخش عرف سوہنا سائیں میرے مرشد صلح کلّی نہیں تھے اور نہ مَیں صلح کلّی ہوں۔ ایک کتاب ''ملفوظاتِ غفاریہ'' کا کوئی تعلق میرے مشائخ سے نہیں اور مجھے نہیں معلوم یہ کس خبیث نے لکھی اور چھپوائی ہے۔ مَیں اس کتاب کے مندرجات سے مکمل برأت و بے زاری کا اعلان کرتا ہوں۔ اور اگر اس خانقاہ کے موجودہ لوگ اس کتاب سے کسی قسم کے تعلق کا اظہار کریں تو مَیں اس سے بھی رجوع کرتا ہوں۔ آئندہ کسی اجتماع میں کسی بدعقیدہ و بدمذہب، دیوبندی، وہابی مودودی وغیرہ کو بطور مہمان ہرگز مدعو نہیں کیا جائے گا۔ اور ان شاء اللہ آئندہ خانقاہ میں تمام معاملات مسلکِ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے مطابق ادا کیے جائیں گے۔ اس تحریر کو تمام سُنّی جراید و رسائل میں شائع کیا جائے گا۔

دستخط: **پروفیسر محمد مقصود الٰہی بن صوفی محمد سلیم**

سرپرست اعلیٰ اسلامی روحانی مشن ٹرسٹ

شاهدین

(۱) شیخ الحدیث علامہ اسماعیل ضیائی صاحب
(۲) علامہ سید شاہ تراب الحق قادری صاحب
(۳) صاحبزادہ محمد ریحان امجد نعمانی صاحب
(۴) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب
(۵) علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی صاحب
(۶) علامہ مفتی عطاء المصطفیٰ اعظمی صاحب
(۷) علامہ مفتی ندیم اقبال سعیدی صاحب
(۸) علامہ سید مظفر حسین شاہ صاحب
(۹) پروفیسر علامہ حبیب الرحمٰن صاحب
(۱۰) علامہ عمیر محمود صدیقی

افکارِ رضا کے خصوصی شمارے کے لیے منتخب عناوین

- مسلک اعلیٰ حضرت کیا ہے؟
- امام احمد رضا اور اتحادِ اہلِ سُنّت
- دورِ حاضر میں فکر رضا کی معنویت
- امام احمد رضا پر الزامات کا جائزہ
- کلام امام میں تصوف کی ضیاباریاں
- امام احمد رضا کی شاعری اور اصلاحِ معاشرہ
- امام احمد رضا کی شاعری اور قرآنی آیات
- امام احمد رضا کی شاعری اور احادیثِ نبویہ
- اعلیٰ حضرت کی شاعری میں عقاید اہلِ سُنّت
- کلامِ رضا میں سیرتِ نبوی کے مباحث
- تصانیفِ رضا اور سیرتِ نبوی ﷺ
- حضرت رضا بریلوی کی شاعری میں ذکرِ صحابہ
- امام اہلِ سُنّت کے علمائے بدایوں سے روابط
- امام اہلِ سُنّت مشائخ مارہرہ کی نظر میں
- امام اہلِ سُنّت کا اسلوبِ نگارش
- امامِ اہلِ سُنّت کی نثری خصوصیات
- امام احمد رضا کی فکری تنقیدیں
- امام احمد رضا ار اصولِ تنقید و تحقیق
- رضا بریلوی کی شاعری اور ردِّ بدعت و منکرات
- امام احمد رضا بریلوی کا کلام اور ردِّ بدمذہبیت
- امام احمد رضا کی بدنامی کے اسباب
- امام احمد رضا ...... شریعت و طریقت کا حسین سنگم
- امام احمد رضا منبع تصوف
- رضا بریلوی کے نظریۂ تعلیم کی معنویت
- اعلیٰ حضرت ...... تواضع و انکساری کے آئینہ میں
- امام احمد رضا اور جنگِ آزادیِ ہند
- امام احمد رضا اور حسام الحرمین
- امامِ اہلِ سُنّت کی حاشیہ نگاری
- امامِ اہلِ سُنّت کے اخلاقِ کریمانہ
- سلامِ رضا اور اس کی مقبولیت کے اسباب
- امام احمد رضا اور علومِ عقلیہ
- دورِ حاضر میں فکر رضا کی معنویت
- امام احمد رضا کے خانوادۂ اشرفیہ سے تعلقات پر ایک نظر
- رضا بریلوی کی تحقیقات اور جزئیات اسلاف سے اختلاف
- تحریکِ آزادیِ ہند میں خلفائے اعلیٰ حضرت کا حصہ
- امام احمد رضا کا نظریۂ تعلیم اور عصر حاضر کے مدارسِ اسلامیہ

ان شاء اللہ افکارِ رضا کا ۵۰ واں شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء) خاص نمبر ہوگا۔ مقالہ نگار اپنے مقالات ۳۱ر اگست ۲۰۰۷ء تک بھیجنے کی کوشش کریں۔ رسالہ نومبر ۲۰۰۷ء کے وسط میں شائع ہوگا۔ ان شاء اللہ

نوٹ: افکار رضا کا ۵۰ واں شمارہ آخری شارہ ہوگا۔ اس کے بعد افکار رضا بند کردیا جائے گا۔

تحریک فکر رضا

ہمارے مقاصد :

☆ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے افکار ونظریات کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرانا۔

☆ علماء اہل سنّت و جماعت کی رہنمائی میں مفکرین اور محققین کی ایک ٹیم کا فکر رضا کی ترویج واشاعت میں دن رات کوشاں رہنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو سہل انداز میں جدید اسلوب کے ساتھ شائع کرنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو ملک کی مختلف اور بین الاقوامی زبانوں میں شائع کرانا۔

☆ اربابِ فکر و دانش کو امام احمد رضا کی تحقیقات کی طرف متوجہ کرنا۔

☆ ہر اُٹھتے ہوئے سوالوں کا امام احمد رضا کی تحقیقات کی روشنی میں جواب دینا۔

فکرِ رضا کو عام کرنے کے لیے آپ ہمارا تعاون کیجیے۔
آپ کا تعاون جہاد بالقلم میں ہمارا مددگار ہوگا۔

AFKAR-E-RAZA (URDU QUARTERLY)
95, Undria Street, Chowki Mohalla, Mumbai - 400 008. E-mail : editor@fikreraza.net

If U[illegible]elivered Please return to : M. ISHAQ 45/A, Memonwada Road, 2/6, Mumbai - 400003.